جلد ۸۹، ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۲ء، عدد ۲

مضامین

شذرات

آجکل ہندوستان کے باشندوں میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا بڑا غلغلہ ہے، اسکی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، ملک کی سالمیت اور قومی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر قوم اور ہر فرقہ کے لسانی، تہذیبی اور کلچرل تحفظ کے ساتھ قومی و وطنی امور و مسائل میں جذباتی ہم آہنگی ضروری ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد صرف اکثریت کے مختلف طبقوں کے درمیان لسانی اور صوبائی اختلافات کا دور کرنا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اقلیتوں کے ان مسائل کا جو اختلاف کی بنیاد ہیں، کوئی ذکر نہیں آتا، دوسرے تعلیم کے ذریعہ قومی یکجہتی پیدا کرنے کا جو سہ لسانی فارمولا بنایا گیا ہے اور جس پر جلد ہی عمل ہونے والا ہے، اس میں زبانوں کی تعلیم کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ ان صوبوں میں جہاں اردو بھی بولی جاتی ہے اور جن کے ایک طبقہ کی مادری زبان بھی ہے، اردو کی تعلیم میں مختلف قسم کی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں، اور مشکل ہی سے اس کی تعلیم کی گنجایش نکل سکتی ہے۔

اس حقیقت سے اردو دشمنوں کے علاوہ کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ امتیاز صرف اردو کو حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور طبقوں کی تہذیب و کلچر کی ترجمان ہے اور مدتوں سے ان میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا فرض انجام دیتی چلی آرہی ہے، اور ان کے درمیان ربط و تعلق کا بہت بڑا وسیلہ ہے، اس وصف میں ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، آج بھی ہندوستان کے جس خطہ میں بھی چلے جایئے اردو زبان ہی باہمی تعارف کا ذریعہ ثابت

ہوگی، اس لیے ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو زبان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے،

اردو کا مسئلہ تقریباً پورے شمالی ہند خصوصاً اترپردیش میں لسانی اختلافات کا سبب بنا ہوا ہے، اس فارمولے میں بھی اس کا کوئی حل نہیں ہے، اسی سے اس صوبہ میں جہاں سب سے زیادہ جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس فارمولے سے اور زیادہ تفریق و اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اسلیے اسکی بڑی ضرورت ہے کہ اس فارمولے پر عمل سے پہلے حکومت اس میں ایسی ترمیم کر دے کہ بغیر کسی دشواری کے اردو کی تعلیم کے لیے گنجایش نکل سکے، اردو کے بہی خواہوں کو فوراً اس کی جانب حکومت کو توجہ دلانا چاہیے، مولانا شاہد فاخری نے بروقت اس کی جانب توجہ کی ہے اور ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں اس فارمولے میں اردو کی تعلیم کی دشواریوں کی تفصیل اور اسکا حل تحریر کیا ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی دینی، تعلیمی اور علمی خدمات اتنی روشن ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، ہندوستان میں عربی کے پرانے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں سب سے پہلے اسی نے انقلاب پیدا کیا اور آج یہاں کے بیشتر عربی مدارس اسی کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہیں، اور الحمد للہ کہ اس نازک دور میں بھی جب ہندوستان کے دینی اداروں کے لیے اپنا وجود قائم رکھنا مشکل ہو رہا ہے، ندوہ نہ صرف اپنی قدیم روایات اور خصوصیات پر قائم بلکہ ہر حیثیت سے روز افزوں ترقی پر ہے، اس کی تعلیمی شہرت ہندوستان کے باہر تک اتنی پھیل گئی ہے کہ اس وقت مختلف اسلامی اور عربی ملکوں کے طلبہ ندوہ میں زیر تعلیم ہیں، طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھی، متعدد نئی عمارتیں بن گئی ہیں، عربی زبان کی تعلیم کا معیار اتنا بلند ہو گیا ہے کہ عرب اہل علم کو بھی اس کا اعتراف ہے، اور اس وقت دار العلوم سے عربی کا ایک پندرہ روزہ اخبار الرائد اور ایک ماہانہ رسالہ البعث الاسلامی نکلتا ہے، جو عرب ملکوں میں بھی مقبول ہے، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم ہے جس کا مقصد دینی امور و مسائل

اور اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر اسلامی تعلیمات اور موجودہ ذہن کی روشنی میں تحقیقات اور تصنیف و اشاعت، یہ ادارہ دو سال کے مختصر عرصہ میں کئی مفید اور قابل قدر کتابیں شائع کر چکا ہے، اس کے علاوہ اور بھی دینی و علمی کام انجام پا رہے ہیں، مگر ایسے وسیع اور اہم کاموں کے مقابلہ میں اس کے مالی وسائل محدود ہیں جس سے مالی دشواریاں پیش آتی ہیں، اور موجودہ ہندوستان میں ان کاموں کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، اس لیے اصحاب خیر مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان کاموں کی تکمیل میں پوری امداد کریں کہ یہ دین کی بھی خدمت ہے اور علم کی بھی،

معارف تقریباً نصف صدی سے جو علمی خدمت انجام دے رہا ہے اس سے اہل علم پوری طرح واقف ہیں، اس پر نازک دور بھی آئے مگر اس فریضہ سے وہ دست کش نہوا، معارف ایک خالص علمی پرچہ ہے، اس لیے اس کا حلقہ ہمیشہ محدود رہا، اور کبھی اس کے ذریعہ کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا، لیکن ہندوستان کی تقسیم کے پہلے وہ خود کفیل تھا، اس کی آمدنی اس کے مصارف کے لیے کافی ہو جاتی تھی، مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد سکہ کے تبادلہ اور چندہ کی وصولی کی دقتوں کی وجہ سے پاکستان کے خریداروں کی تعداد بہت گھٹ گئی جس کا اثر اس کی آمدنی پر بھی پڑا اور وہ کئی سال سے خسارہ سے چل رہا ہے، اگر وہ کوئی تجارتی رسالہ ہوتا تو اب تک بند ہو چکا ہوتا، مگر اس کا مقصد خالص علمی خدمت ہے اور وہ دار المصنفین کا رسالہ ہے اسلیے اب تک قائم ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا، لیکن دار المصنفین کے قدردانوں اور اردو زبان کے ہمدردوں کا کم سے کم یہ تو فرض ہے کہ وہ اس کو مالی زیر باری سے سبکدوش کر دیں، اگر وہ اسکی توسیع اشاعت کیجانب تھوڑی سی توجہ بھی کر دیں تو آسانی سے مالی خسارہ پورا ہو سکتا ہے، اردو کے ہمدرد بھی خواہ زبانی تو اس کی کس مپرسی کا رونا بہت روتے ہیں مگر اس کے بقا اور ترقی کے جو وسائل ان کے اختیار میں ہیں اس کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتے،

مقالات

"دین رحمت"

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۵)

اس بحث کا ایک پہلو اسلامی جہاد بھی ہے، اس کے بارہ میں بڑی غلط فہمیاں ہیں، بہت سے ناواقف غیر مسلم جہاد کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں پر حملہ کر کے ان کو زبردستی مسلمان بنانے اور جو انکار کرے، اس کو قتل کر کے اس کے مال و متاع پر قبضہ اور اس کے بیوی بچوں کو لونڈی غلام بنانے کا نام جہاد ہے، اس مفہوم کو اسلامی جہاد سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اس پر تفصیلی بحث طویل ہو گی جس کی اس موقع پر گنجایش نہیں ہے، اس لیے اس غلط فہمی کے ازالہ کی حد تک جہاد کی حقیقت بیان کیجاتی ہے۔

جہاد جہد سے مشتق ہے، جس کے معنی کوشش، جد و جہد اور محنت و مشقت کے ہیں، اور اصطلاح میں جہاد ہر اس کوشش کو کہتے ہیں جو خدا کی راہ میں کی جائے، اس میں راہ حق کی تلاش اور اپنے نفس کی اصلاح کا مجاہدہ بھی داخل ہے، امام راغب لکھتے ہیں کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں، ظاہری دشمن سے مجاہدہ، شیطان سے مجاہدہ اور اپنے نفس سے مجاہدہ (مفردات راغب اصفہانی ص ۱۰۰)

راہ خدا میں کوشش اور جد و جہد کا آخری درجہ یہ ہے کہ اگر جان دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی بلا تکلف نثار کر دیا جائے، کلام مجید میں ان سب معنوں میں جہاد کا استعمال کیا گیا ہے۔

راہ خدا کی تلاش کی جد و جہد کے معنی ہیں:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (عنکبوت ع ۷)

اور جو لوگ ہماری راہ (کی تلاش) میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھا دینگے اور بیشک اللہ تعالیٰ خلوص والوں کے ساتھ ہے

اچھے کام میں جد وجہد کے معنی میں

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج ۱۰)

اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔

اپنے نفس کی اصلاح کی کے معنی میں،

ومن جاهد فانما يجاهد لنفسه ان الله غنی عن العالمين (عنکبوت ۱)

اور جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے محنت کرتا ہے اور اللہ سارے جہان والوں سے بے نیاز ہے،

بحث ونظر کے ذریعہ کوشش کرنے کے معنی میں

فلا تطع الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا

پس کافروں کا کہنا نہ مانو اور (دلائل قرآنی کے ذریعہ) ان کا پوری قوت سے مقابلہ کرو،

اسی سے اجتہاد بھی ہے، کیونکہ اس میں کتاب وسنت کی بنیاد پر مسائل کے استنباط میں قیاس کے ذریعہ کوشش کی جاتی ہے،

ان تمام آیات میں جہاد کا استعمال راہ خدا میں مطلق محنت ومشقت کے معنی میں کیا گیا ہے۔

حدیثوں میں بھی جہاد اور مجاہد کا استعمال مختلف معنوں میں ہوا ہے، جابر قوت کے مقابلہ میں اعلان حق کے معنی میں۔

ان اعظم الجهاد کلمة عدل عند سلطان جائر (ابوداؤد وترمذی)

سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے

نفس اور نفسانی خواہشوں سے مجاہدہ کے معنی میں

المجاهد من جاهد نفسه (ترمذی)

مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے (یعنی اس کی اصلاح میں جد وجہد کرے)

حضرت ابوذر غفاریؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سب سے افضل جہاد کون ہے، فرمایا یہ کہ انسان اپنے نفس اور نفسانی خواہشوں سے جہاد کرے (کنز العمال ج ۲ ص ۳۲۰)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اپنی نفسانی خواہشوں کے ساتھ بھی جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرتے ہو (مفردات راغب ص ۱۰۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں، ہاتھ سے جہاد، زبان سے جہاد، اور قلب سے جہاد، انسان سب سے پہلے ہاتھ کے جہاد سے محروم ہوتا ہے (یعنی اس کو چھوڑ دیتا ہے) پھر زبان کے جہاد سے، پھر قلب کے جہاد سے، جب قلب سے معروف ومنکر کا احساس اٹھ جاتا ہے، تو وہ الٹ جاتا ہے اور اس کا اوپر کا حصہ نیچے آجاتا ہے (یعنی بلندی پستی سے بدل جاتی ہے) (کنز العمال ج ۲ ص ۱۳۵)

یہ احادیث اس کا ثبوت ہیں کہ جہاد محض تلوار ہی سے نہیں ہے بلکہ اپنے نفس کی اصلاح، نفسانی خواہشوں کی مخالفت، برائیوں کو ہاتھ اور زبان سے روکنا اور دل سے ان کو برا سمجھنا بھی جہاد ہے بلکہ نفسانی خواہشوں کی مخالفت کو حدیثوں میں جہاد اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کوشش، محنت ومشقت اور جد وجہد کا آخری درجہ یہ ہے کہ اگر خدا کی راہ میں جنگ وخونریزی اور جان لینے اور جان دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں بھی دریغ نہ کیا جائے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے واسطے ترک وطن کیا اور اپنی جان اور مال سے جہاد کیا

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللهِ وَ اُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ (توبہ ۔ ۳)

وہ اللہ کے نزدیک درجہ میں بہت بڑے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اُولٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (حجرات ۔ ۲)

پورے مومن وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک نہیں کیا اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تو یہی لوگ سچے ہیں۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (صف ۔ ۲)

تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مال اور جان سے اس کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہت ہی بہتر ہے

امام راغب لکھتے ہیں کہ ان آیات میں بھی دشمن سے مجاہدہ شیطان سے مجاہدہ اور اپنے نفس سے مجاہدہ تینوں داخل ہیں۔ (مفردات راغب ص ۱۰۰)

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (توبہ ۔ ۶)

نکل پڑو خواہ تھوڑے سامان کے ساتھ خواہ زیادہ سامان کے ساتھ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم یقین رکھتے ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ جنگ و خونریزی ایک وحشیانہ فعل ہے، لیکن بعض اوقات فتنہ و فساد، ظلم و جور اور وحشت و بربریت کو روکنے کے لیے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے، جب ظلم و جور اور جبر و استبداد کو اخلاقی دباؤ سے نہ روکا جا سکے تو ان کو قوت سے روکنا ضروری ہو جاتا ہے، ورنہ دنیا سے حق و صداقت، عدل و انصاف اور خیر و صلاح کا خاتمہ اور فتنہ و شر کی حکومت قائم ہو جائے، ایسی حالت

میں جنگ و خونریزی وحشیانہ فعل نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت بن جاتی ہے، تندرست انسانی جسم میں سوئی چبھونا بھی سنگدلی ہے لیکن اگر کوئی عضو ماؤف ہو جائے اور اس کے اثر سے پورا جسم خطرہ میں پڑ جائے تو ماؤف عضو کو کاٹ کر الگ کر دینا بے رحمی نہیں بلکہ عین رحم اور خیر خواہی ہے، اسلامی جہاد کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے۔

جب دنیا سے خدا کا خوف اٹھ جائے، فضائل اخلاق کا خاتمہ ہو جائے، انسانیت، شرافت اور اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہے، بد اخلاقی اور فتنہ و شر عام ہو جائے، اس وقت ان برائیوں کا روکنا انسانی فریضہ ہے، اگر وہ پند و موعظت اور درس اخلاق سے نہ رکیں اور شر کی طاقتیں آمادہ فساد ہو جائیں تو پھر قوت سے ان کا مقابلہ کرنا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے، اسی کا نام جہاد ہے، ملک گیری اور دوسری قوموں کو محکوم بنانے کے لیے لڑنا جہاد نہیں ہے، دنیاوی لڑائیوں اور اسلامی جہاد کے مقصد اور نصب العین میں بڑا فرق ہے، قرآن مجید اور احادیث نبوی کی رو سے جہاد وہ ہے جس میں کوئی دنیاوی غرض شامل نہ ہو، بلکہ اس کا مقصد محض اعلاء کلمۃ اللہ، خدا شناسی کا احیاء، فتنہ و فساد اور ظلم و جور کا استیصال اور عدل و انصاف اور نیکی و بھلائی کا قیام ہو، اس کی وضاحت ان احادیث سے ہوتی ہے:

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے جہاد کرتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے، ایک اپنی عظمت و ناموری کے لیے جنگ کرتا ہے (یعنی ایسے جہاد کا کیا حکم ہے) آپ نے فرمایا:

من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا (بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا)

جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے آپ سے عرض کیا کہ جہاد اور غزوہ کی حقیقت بیان فرمائیے۔ آپ نے فرمایا اگر تم صبر و ثبات کے ساتھ خالصۃً لوجہ اللہ حصول ثواب کے لیے جنگ کرو گے تو اللہ تعالی

قیامت کے دن صابر اور مخلص مجاہد کی حیثیت سے اٹھائے گا اور اگر دکھاوے اور حصول مال کے لیے جنگ کروگے تو ریاکار اور طالب مال کی حیثیت سے اٹھائیگا۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد)
ایک شخص نے پوچھا کہ ایک آدمی خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدے بھی حاصل کرنا چاہتا ہے، آپنے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہ ملے گا، یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہوا، اس نے تین مرتبہ آپ سے پوچھا آپنے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ اس کو کوئی ثواب نہ ملے گا، (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فیمن تغزو ویلتمس الدنیا)

کلام مجید میں مال غنیمت کو متاع دنیا سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے حصول میں انہماک پر ملامت کی گئی ہے۔ جنگ احد میں کچھ مسلمان کفار کا مقابلہ چھوڑ کر مال غنیمت کی طرف جھک پڑے جس کی بنا پر شکست ہوگئی، ان مسلمانوں کو ان الفاظ میں ملامت کی گئی۔

مِنکُم مَن یُرِیدُ الدُّنیَا وَمِنکُم مَن یُرِیدُ الآخِرَةَ (آل عمران ۶۰)	تم میں کچھ لوگ دنیا کے طلب گار ہیں اور کچھ لوگ آخرت کے۔

جنگ بدر میں مال غنیمت یا زر فدیہ کے حصول کی طمع پر یہ آیت نازل ہوئی:

تُرِیدُونَ عَرَضَ الدُّنیَا وَاللهُ یُرِیدُ الآخِرَةَ	تم لوگ متاع دنیا چاہتے ہو اور خدا آخرت چاہتا ہے۔

مال غنیمت لینے سے آخرت کا اجر کم ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ

ما من غازیة تغزوا فی سبیل اللہ فیصیبون الغنیمة الا تعجلوا ثلثی اجرھم من الآخرة ویبقی لھم الثلث وان لم یصیبوا غنیمة تم لھم اجرھم (مسلم کتاب الامارة باب بیان قدر ثواب من غزا فغنم ومن لم یغنم)	جو غازی راہ خدا میں لڑتا ہے اور مال غنیمت پالیتا ہے وہ آخرت کا دو تہائی ثواب دنیا ہی میں لے لیتا ہے اور آخرت میں اسکا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے البتہ اگر غنیمت مطلق نہ ملے تو اس کو پورا اجر آخرت میں ملے گا۔

ان آیات و احادیث سے ظاہر ہے کہ جہاد کا مقصد حصول مال نہیں ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ مال غنیمت مجاہدین کا حق نہیں ہے، وہ انہی لوگوں کا حق ہے جنھوں نے جہاد میں اپنی جان کی بازی لگائی۔ ان آیات و احادیث کا مقصد صرف یہ ہے کہ مجاہدین مال غنیمت کو مقصود نہ بنالیں، مال غنیمت میں اسلام نے یہ اصلاح بھی کی کہ اس میں مجاہدین کے ساتھ خدا، رسول، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کو بھی حصہ دار بنا دیا،

وَاعلَمُوا اَنَّمَا غَنِمتُم مِن شَیءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِی القُربیٰ وَالیَتٰمیٰ وَالمَسٰکِینِ وَابنِ السَّبِیلِ (انفال)	اور جان لو کہ تم کو جو مال غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافر کا۔

غیر مسلموں کو جبریہ مسلمان بنانے کا نام بھی جہاد نہیں ہے، کیونکہ دین میں جبر و زبردستی نہیں ہے کلام مجید میں صراحت کے ساتھ ارشاد ہے

لَا اِکرَاهَ فِی الدِّینِ قَد تَبَیَّنَ الرُّشدُ مِنَ الغَیِّ (البقرہ ۳۴)	دین میں زبردستی نہیں ہے ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔
وَلَو شَاءَ رَبُّکَ لَآمَنَ مَن فِی الاَرضِ کُلُّهُم جَمِیعًا اَفَاَنتَ تُکرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُونُوا مُؤمِنِینَ (یونس ۱۰)	اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو روئے زمین کے سارے لوگ ایمان لے آتے تو کیا تم مجبور کر سکتے ہو کہ سب ایمان لے آئیں۔

قُلْ یَاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمُ
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنِ اھْتَدٰی
فَاِنَّمَا یَھْتَدِیْ لِنَفْسِہٖ وَمَنْ
ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا وَمَا اَنَا
عَلَیْکُمْ بِوَکِیْلٍ (یونس - ۱۱)

اے پیغمبر لوگوں سے کہدو کہ حق بات تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس آچکی پس جس نے راہ راست اختیار کی تو اپنے ہی فائدے کیلئے اختیار کی اور جو گمراہ ہوا تو اس کا نقصان اسی کو پہنچے گا اور میں تم پر مسلط نہیں ہوں۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَاءَ
فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ
(کہف - ۴)

اے پیغمبر کہہ دو کہ تمھارے رب کی طرف سے حق آچکا، پس جس کا جی چاہے اس کو مانے جس کا جی چاہے انکار کرے۔

یہ آیات اس کی شاہد ہیں کہ دین میں جبر و زبردستی نہیں ہے، پیغمبر کا کام خدا کا پیغام بندوں تک پہنچا دینا ہے، اس کے منوانے کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس پہلو سے بھی لائق غور ہے کہ ایمان تو زبان سے اقرار اور دل سے یقین دونوں کا نام ہے، اور زبردستی زبان سے تو اقرار کرایا جا سکتا ہے، مگر دل میں یقین نہیں پیدا کرایا جا سکتا۔ اس لیے درحقیقت وہ ایمان و اسلام ہی نہیں ہے، جس کو جبر سے منوایا جائے۔ اس لیے جبریہ مسلمان بنانے کے لیے جہاد کے کوئی معنی ہی نہیں، صرف ان لوگوں کے مقابلہ میں ہے جو نہ صرف کفر و طغیان پر اڑے رہتے تھے، بلکہ خدا کا پیغام [illegible] کے جرم میں مسلمانوں کو مشق ستم بناتے تھے، ان کو وطن سے نکالتے تھے، اور ان پر عرصۂ زمین تنگ کر دیا تھا۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ
ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ
لَقَدِیْرُ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ

جن مسلمانوں سے کفار جنگ کرتے ہیں انکو اس بنا پر جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا انکی مدد پر قادر ہے۔

دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ
یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ (حج - ۱۵)

وہ لوگ اپنے گھروں سے صرف اس لیے نکالے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار خدا ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جو خدا اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان میں حلال و حرام کی کوئی تمیز باقی نہ رہ گئی تھی،

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ
وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ
مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ
(براۃ)

ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسول نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے اس کو حرام نہیں سمجھتے۔

خدا کی زمین پر فتنہ و فساد کرتے ہیں۔

وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ
(انفال)

اور ان سے جنگ کرو تا کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے۔

جہاد کا مقصد ملک گیری، حصول اقتدار اور مال و دولت نہیں ہے، بلکہ خدا کی عبادت کا قیام، غرباء و مساکین کی پرورش، نیک کاموں کی تبلیغ و ترغیب اور برائیوں کا انسداد ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا
عَنِ الْمُنْکَرِ

اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیدیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

جہاد محض خونریزی کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں ثبات و استقلال کے ساتھ خدا کا ذکر بھی ضروری ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (انفال)

اے ایمان والو جب کسی جماعت سے تمھارا مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور زیادہ سے زیادہ خدا کا ذکر کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

اس لیے جس طرح نماز میں تکبیر و تہلیل اور تسبیح و تحمید کیجاتی ہے، مجاہدین جنگ میں بھی کرتے تھے،

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ جب ہم جہاد میں کسی چڑھائی پر چڑھتے تھے اور نشیب میں اترتے تھے تو تسبیح کرتے تھے۔ (بخاری کتاب الجہاد باب التسبیح اذا ہبط وادیا)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں تھے، جب ہم کسی وادی میں ہوتے تو بلند آواز سے تکبیر و تہلیل کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو آہستہ کہو، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکارتے ہو، وہ تو تمھارے ساتھ ہی ہے، سننے والا ہے اور تم سے قریب ہے۔ (بخاری کتاب الجہاد باب ما یکرہ من رفع الصوت فی التکبیر)

اس طرح وہ جنگ جو وحشت و بربریت کا مجموعہ تھی اس کو اسلام نے اعلاء کلمۃ اللہ، فتنہ و فساد کے استیصال، مظلوموں کی امداد، خدا کی تکبیر و تحمید اور تسبیح و تہلیل میں بدل دیا، اس نے جنگ کی ظاہری شکل میں بھی اصلاح کی اور ان تمام بے رحمیوں اور سفاکیوں کو جو دشمنوں اور مفتوحوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھیں، روک کر جنگ کو صرف دلیرانہ مقابلہ تک محدود کر دیا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔

لا تقتلوا شيخا فانيا ولا طفلا ولا صغيرا ولا امرأة (بخاری کتاب الجہاد)

بہت بوڑھے، بچے، کمسن اور عورتوں کو قتل نہ کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی غزوہ میں ایک عورت قتل کر دی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرما دی۔ (بخاری کتاب الجہاد باب قتل النساء فی الحرب)

بعض ائمہ کا قول یہاں تک ہے کہ اگر دشمن عورتوں اور بچوں کو سامنے کر کے آگے بڑھیں یا عورتوں اور بچوں کے ساتھ قلعہ بند ہو جائیں، یا دشمن مردوں کے ساتھ کشتی پر عورتیں اور بچے بھی سوار ہوں تو دشمن پر تیر اندازی نہ کرنا چاہیے اور نہ آگ برسانا چاہیے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۱۰۴)

اسی طریقہ سے قیدیوں کو باندھ کر نشانہ بنانے کی ممانعت فرما دی، حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ قیدی کو باندھ کر نشانہ بنانے کی ممانعت ہے. خدا کی قسم میں مرغی کو بھی اس طرح مارنا پسند نہیں کرتا۔ (ابو داؤد کتاب الجہاد باب قتل الاسیر صبرا)

مثلہ کرنے یعنی انسانی اعضا کو کاٹ کر قتل کرنے اور مقتول کے اعضاء کو کاٹنے کی بھی ممانعت ہے، حضرت سمرہ بن جندبؓ کا بیان ہے کہ

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحثنا على الصدقة وينهانا عن المثلة (ابو داؤد کتاب الجہاد باب النہی عن المثلہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور مثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے۔

اسی طریقہ سے آگ میں جلا کر مارنا ممنوع قرار دیا۔ اور فرمایا

ان النار لا يعذب بها الا الله (بخاری کتاب الجہاد)

آگ سے عذاب دینے کا حق صرف خدا کو ہے۔

فوجیوں کے ہاتھوں کسی زمانہ میں بھی پُر امن آبادیاں محفوظ نہیں رہی ہیں، آج بھی جن مقاموں سے فوجیوں کا گذر یا ان کا پڑاؤ ہوتا ہے اس کے آس پاس کی آبادیوں پر مصیبت آجاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ممانعت فرما دی کہ ایسے لوگوں کا جہاد ہی مقبول نہیں ہے۔

انس بن جہنی روایت کرتے ہیں کہ فلاں فلاں غزوے میں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، لوگوں نے آس پاس کی آبادیوں کے گھروں پر جا کر ان کو تنگ کیا اور لوٹا مارا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے منادی کرادی کہ جو لوگ گھروں پر جاکر لوگوں کو تنگ کرتے ہیں اور لوٹتے مارتے ہیں ان کا جہاد مقبول نہیں۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد)

ایک انصاری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ کسی مہم میں بڑی مصیبت اور تنگ حالی میں مبتلا ہوگئے، اتفاق سے بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا اس کو دیکھکر سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے، بکریوں کا گوشت چڑھا ہوا پک رہا تھا، اور ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا۔ پھر فرمایا لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی النہی عن النہبی اذا کان فی الطعام قلۃ فی ارض العدو)

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب کسی مہم پر فوج بھیجتے تھے تو خاص طور سے لوٹ مار اور تمام وحشیانہ افعال کی نہایت سختی سے ممانعت فرماتے تھے، یزید ابی سفیان کی ماتحتی میں جب شام پر فوج بھیجی تو حسب ذیل ہدایات فرمائیں:۔

انی اوصیک بعشر خصال لا تقتلوا امرأۃ ولا صبیا ولا کبیرا ھرما ولا تقطع شجرا مثمرا ولا تخربن عامرا ولا تعقرن شاۃ ولا بعیرا الا لماکلۃ ولا تحرقن نخلا ولا تغفل ولا تجبن (تاریخ الخلفاء سیوطی ۹۶)

میں تم کو دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں، کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی پھلدار درخت کو نہ کاٹنا، کسی آبادی کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کھانے کے علاوہ بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، خیانت اور بزدلی نہ کرنا۔

دشمنوں کے مقابلہ میں آج بھی معاہدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، اور کوئی قوم بھی ان کے

عہد و پیمان کا لحاظ نہیں کرتی، یہی حال کفار و مشرکین عرب کا تھا، وہ بار بار معاہدہ کرکے توڑ دیتے تھے، اس کے باوجود کلام مجید نے مسلمانوں کو اپنی جانب سے معاہدہ توڑنے کی ممانعت کی ہے اور جب تک خود مشرکین معاہدہ شکنی نہ کریں مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں ہے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ - ۲)

اللہ اور اسکے رسول کے نزدیک مشرکین کا عہد کیونکر معتبر ہو (کیونکہ انھوں نے بار بار عہد شکنی کرکے اپنا اعتبار کھودیا ہے) مگر جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے (یعنی صلح حدیبیہ) تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی انکے ساتھ سیدھے رہو، اللہ (بدعہدی) سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (توبہ - ۲)

ایک دوسری آیت میں ہے:

الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ (انفال - ۷)

تم نے جن لوگوں سے عہد و پیمان کیا ہے پھر وہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں اور (عہد شکنی سے) نہیں ڈرتے ہیں، اگر تم ان کو لڑائی میں پاؤ تو ان پر حملہ کرکے (ان کے ذریعہ) ان لوگوں کو جو ان کے پیچھے ہیں منتشر کردو، شاید وہ لوگ سمجھ جائیں اور اگر تم کو کسی قوم سے خیانت (عہد شکنی) کا اندیشہ ہو تو وہ عہد ان پر اس طرح واپس کردو کہ دونوں برابر ہوجائیں، بیشک اللہ خیانت (عہد شکنی)

اس کی وضاحت حسب ذیل حدیث سے ہوتی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں:

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	جو شخص اپنے ہم عہد کو قتل کرے گا
قال من قتل معاهداً لم یرح	وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔
رائحة الجنة (بخاری)	

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان الغادر ینصب له لواء	قیامت میں معاہدہ توڑنے والے کا ایک
یوم القیامة فیقال هذه غدرة	جھنڈا نصب کیا جائیگا اور کہا جائے گا کہ
فلان بن فلان (ابو داؤد کتاب الجہاد	یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی کا
باب فی الوفاء بالعہد)	(نشان) ہے۔

حتی کہ زمانۂ جاہلیت میں جو معاہدہ ہوا ہو اس کی پابندی بھی ضروری ہے،

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں
قال فی خطبته اوفوا بحلف الجاہلیة	فرمایا کہ جاہلیت کے معاہدوں کو بھی پورا کرو
فانه لا یزیده یعنی الاسلام	کیونکہ اسلام اس کی پابندی کا اور زیادہ
الا شدة ولا تحدثوا حلفا	حکم دیتا ہے، البتہ (اب ضرورت) کوئی
جلد ایک ۱ (ترمذی)	نیا معاہدہ نہ کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ کی پابندی کا جس قدر لحاظ فرماتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک صحابی حضرت ابو جندلؓ کو ان کے والد سہیل بن عمرو نے جو مشرک تھے، قبول اسلام کے جرم میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر قید کر دیا تھا، وہ عرصہ تک قید و بند کی مصیبت جھیلتے رہے، اتفاق سے ان کے والد صلح حدیبیہ کے زمانہ میں مشرکین کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے معاہدہ کی کتابت کرانے آئے، اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ قریش کا جو آدمی بھی خواہ وہ مسلمان ہی ہو اگر بھاگ کر مسلمانوں کے پاس چلا آئے گا تو وہ اس کو واپس کر دیں گے، ابھی معاہدہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ابو جندلؓ باپ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے اور عین معاہدہ کی کتابت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حدیبیہ پہنچ گئے، ان کے والد سہیل نے کہا ان کو واپس کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابھی تو صلح نامہ مکمل نہیں ہوا سہیل مصر ہوئے کہ اگر ابو جندل کو واپس نہ کیا گیا تو پھر کسی شرط پر صلح نہ ہوگی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے، ابو جندل کو مشرکوں نے اتنا مارا تھا کہ جسم پر نشان پڑ گئے تھے، انھوں نے نشان دکھا کر کہا مسلمانو! کیا کفار کے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے لیے پھر مجھکو ان کے حوالے کرتے ہو، حضرت عمرؓ ان کی فریاد سے بہت متاثر ہوئے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جب ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر ہیں تو ہم کیوں دب کر صلح کریں، آپ نے فرمایا، میں خدا کا پیغمبر ہوں، اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، وہی میرا مددگار ہے۔ (بخاری باب الشروط والمصالحة مع اہل الحرب)

غرض ابو جندل کو اسی طرح پا بجولاں حوالہ کر دیا گیا، انھوں نے پھر فریاد کی کہ مسلمانو! کیا میرے مذہب میں رخنہ ڈالنے کے لیے مجھکو قریش کے حوالے کرتے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلدہی کے لیے فرمایا، ابو جندل صبر و ضبط سے کام لو، خدا تمہارے اور دوسرے مظلوم مسلمانوں کے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے گا، ہم صلح کر چکے اور صلح کے بعد عہد شکنی نہیں کر سکتے۔ (استیعاب ج ۲ تذکرہ ابو جندل و ابو بصیر)

ایک مرتبہ قریش نے ابو رافع کو قاصد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، آپ کی خدمت میں حاضری کے بعد ان کا دل اسلام سے متاثر ہو گیا، انھوں نے عرض کیا کہ اب میں کافروں کے پاس واپس نہ جاؤں گا، آپ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روکنا عہد کے خلاف ہے،

اس لیے اس وقت لوٹ جاؤ، اگر یہ تاثر قائم رہے تو پھر واپس چلے آنا، چنانچہ وہ لوٹ گئے، اور دوبارہ واپس آکر مشرف باسلام ہوئے۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب وفاء العہد)

صحابۂ کرام نے بھی ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا،

حضرت امیر معاویہؓ اور رومیوں سے ایک مقررہ مدت تک کے لیے صلح ہوگئی تھی، امیر معاویہؓ چاہتے تھے کہ صلح کی مدت ختم ہونے کے ساتھ ہی حملہ کردیں، اس لیے انھوں نے پہلے سے ہی آہستہ آہستہ پیشقدمی شروع کردی، ابھی یہ پیش قدمی جاری تھی کہ ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا، وہ زور زور سے کہہ رہا تھا کہ اللہ اکبر اللہ اکبر لوگو! عہد پورا کرو، دھوکا نہ دو، لوگوں نے دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عمرو بن عنبسہؓ تھے، حضرت امیر معاویہؓ نے ان سے اس کا سبب پوچھا، انھوں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم سے کسی کا معاہدہ ہو تو اس کو چاہیے کہ جب تک اس کی مدت پوری نہ ہو جائے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرے یا پھر جس سے معاہدہ ہوا ہے اس کو جتا کر عہد واپس کردے (یعنی اگر ضرورت مجبور کرے تو پہلے سے معاہد کو فسخ معاہدہ کی اطلاع دیدے) یہ سنکر حضرت امیر معاویہؓ لوٹ گئے (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الامام یکون بینہ وبین العدو عہد فیسیر نحوہ)

اسلام نے جنگی قیدیوں کے بارہ میں بھی بڑی اصلاح کی، دنیا کی کوئی قوم بھی جنگی قیدیوں کو بلا کسی شرط و قید کے نہیں چھوڑ دیتی، خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ جنگی قوت کا دار و مدار لڑنے والوں کی تعداد پر تھا، جنگی قیدیوں کو یوں ہی چھوڑ دینے کے معنی یہ تھے کہ دشمن کو طاقت پہنچائی جائے، اسلیے یا جنگی قیدیوں کو معاوضہ لے کر چھوڑا جاتا تھا یا لونڈی غلام بنا لیا جاتا تھا یا قتل کر دیا جاتا تھا، اسلام نے قتل کا طریقہ بالکل بند کر دیا اور اشتہاری مجرموں کے علاوہ عام جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کی ممانعت کردی، باقی دو صورتیں قائم رکھیں اور تیسرا طریقہ بلا کسی معاوضہ کے رہا کرنے کا بھی جاری کیا،

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً (محمد - ۱)

یعنی قید کرنے کے بعد یا احسان رکھ کر چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لیکر۔

اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوسکیں یا مصالح کے خلاف ہوں تو تیسری صورت لونڈی غلام بنانے کی قائم رکھی اور یہ امام کے اختیار تمیزی پر ہے کہ وہ حالات کے اعتبار سے جس صورت کو چاہے اختیار کرے، غلامی کا مسئلہ ایک الگ بحث ہے، اس میں بھی اسلام نے اتنی اصلاح کی کہ وہ درحقیقت غلامی نہیں رہ گئی، اس کی تفصیل آئندہ غلامی کی بحث میں آئے گی۔ عہد رسالت میں احسان رکھکر یا فدیہ دیکر رہا کرنے اور غلام بنانے تینوں پر عمل تھا، بعض غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کسی شرط و قید کے قیدی رہا کردیے،

غزوۂ حنین کے قیدیوں کی تعداد کئی ہزار تھی، ان کے قبیلہ بنی ہوازن کے وفد نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان پر احسان کرکے ان کے قیدی رہا کردیے جائیں، آپ کی دائی حلیمہ سعدیہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں، اس تعلق سے آپنے ان کی درخواست قبول کرلی اور فرمایا میں اپنے اور بنی عبد المطلب کے حصہ کے قیدی رہا کرتا ہوں، باقی دوسرے مسلمانوں کے حصہ کے قیدیوں کے بارہ میں ان سے پوچھوں گا۔ مہاجرین و انصار نے آپ کا طرز عمل دیکھکر اپنے حصہ کے قیدی آپ کی خدمت میں پیش کردیے۔ (طبقات ابن سعد ج اول ص ۱۱۱)

باقی قیدیوں کے بارہ میں آپ نے عام مسلمانوں کے سامنے خطبہ دیا اور فرمایا کہ تمھارے بھائی بنی ہوازن نادم ہوکر تمھارے پاس آئے ہیں، میری رائے ہے کہ ان کے قیدی رہا کردیے جائیں، اس لیے جس کا دل چاہے خوش دلی سے رہا کردے اور جس کا دل نہ چاہے وہ اپنے حصہ کے قیدی لے لے، مسلمانوں نے عرض کیا کہ ہم سبنے خوش دلی سے رہا کردیا، مگر آپ کو اطمینان نہیں ہوا، فرمایا اس طرح صحیح اندازہ نہیں ہوگا، تم لوگ اپنے اپنے نمایندے بھیجو، وہ آکر بتائیں،

چنانچہ ان کے نمائیدوں نے آکر ان کی طرف سے کہا کہ ہم سبنے خوشی دلی کے ساتھ آزاد کر دیا۔ (بخاری ج اول ص ۴۴۲ ملخصاً)

لیکن بلا کسی شرط و قید کے رہائی جنگی مصالح کے خلاف تھی، اس لیے عموماً فدیہ لیکر چھوڑا جاتا تھا، یا آخری درجہ میں غلام بنا لیا جاتا تھا، اور فدیہ دے کر رہا ہونے والے قیدی جب تک وہ مسلمانوں کی قید میں رہتے تھے، ان کے ساتھ شریفانہ سلوک کیا جاتا تھا، ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پاتی تھی، اس زمانہ میں اسیران جنگ کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا عام دستور تھا، تہذیب و ترقی کے اس دور میں بھی اسیران جنگ کے متعلق بین الاقوامی قوانین جو بھی ہوں لیکن عملاً ان کے ساتھ دور وحشت سے بہتر سلوک نہیں ہوتا جس سے اخبار بین طبقہ پوری طرح واقف ہے، یہ اسلام ہی کا فیض ہے کہ اس نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً جنگی قیدیوں کو صحابہ کرام میں تقسیم کر دیتے اور تاکید فرمادیتے تھے کہ ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، چنانچہ غزوۂ بدر کے جنگی قیدیوں کو صحابہ کے حوالہ کرکے ہدایت فرمادی تھی کہ ان کو آرام سے رکھا جائے، ان میں ایک قیدی ابوعزیز تھے، انکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے حوالہ کیا تھا، ان کا بیان ہے کہ جب کھانا سامنے آتا تو انصار مجھکو کھانا کھلاتے اور خود کھجوروں پر گذارا کرتے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت فرمادی تھی، مگر مجھے یہ دیکھکر شرم آتی تھی کہ وہ لوگ مجھکو روٹی کھلاتے تھے اور خود کھجور کھاکر رہ جاتے تھے، اس لیے میں روٹی ان کی طرف بڑھادیتا مگر وہ نہ لیتے۔ (طبری ص ۱۳۳۸)

حنین کے تمام قیدیوں کو جنکی تعداد کئی ہزار تھی، آپ نے قبطی کپڑے مرحمت فرمائے، (طبقات ابن سعد قسم اول ص ۱۱۱)

غرض اسیران جنگ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دیجاتی تھی، خود کلام مجید میں قیدیونکے ساتھ

احسان وسلوک کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جہاں خدا کے خاص بندوں کے اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں ایک وصف قیدیوں کو کھانا کھلانا بھی ہے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ — اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین یتیم

مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا — اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

اسلامی جہاد کے احکام اور اس کے شرائط وقیود اور بھی ہیں مگر ان پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے، اوپر کے واقعات سے یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہوگی کہ جہاد کا مقصد ملک گیری، قوموں کو محکوم بنانا اور مال و دولت کا حصول نہیں ہے، بلکہ وہ جہاد ہی نہیں ہے جس میں کوئی دنیاوی غرض شامل ہو، جہاد کا اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ، خداشناسی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قیام، ظلم وجور، فتنہ و فساد، برائیوں اور بداخلاقیوں کا انسداد، نیکی اور بھلائی کی تبلیغ و اشاعت ہے، اور جہاد انہی غیر مسلموں کے مقابلہ میں ہے جو اس راہ میں مزاحم ہوں اور تبلیغ اسلام کے جرم میں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن بن جائیں اور ان کے استیصال کے درپے ہو جائیں۔

(باقی)

علمائے اسلام کے القاب کی تاریخ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ، بمبئی

(۲)

مزکی مزکی کا لفظ تزکیہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صفائی کرنے اور اسلامی عدالت کے گواہوں کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچا کر ان کی توثیق کرنے کے ہیں، علامہ سمعانی کا بیان ہے:

هذا اسم لمن يزكي الشهود	مزکی اس شخص کو کہتے ہیں جو گواہوں
ويبحث عن حالهم ويبلغ القاضي	کی تحقیق کرکے ان کے صحیح حالات معلوم
حالهم	کرتا ہے اور قاضی کو ان کی خبر دیتا ہے۔

مزکیوں میں یہ حضرات زیادہ مشہور ہیں (۱) ابو حامد احمد بن ابراہیم بن محمد بن یحییٰ المزکی، ان کے والد بھی مزکی تھے، نہایت صالح اور اپنے زمانہ کے عبّاد و زہّاد میں سے تھے (۲) ابو الفضل المزکی مشہور مزکی اور محدث عصر تھے (۳) ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد بن یحییٰ المزکی، نیشاپور کے سب سے بڑے عالم تھے (۴) اور ان کے بیٹے یحییٰ بن ابراہیم المزکی بھی اسی عہدہ پر فائز تھے۔

یہ عہدہ ذاتی قابلیت کی بنا پر دیا جاتا تھا، مگر بعض خاندان کے افراد نسلاً بعد نسلٍ اس خدمت پر مامور ہوا کرتے تھے، علامہ سمعانی کا بیان ہے:

واشتهر بهذا بنيسابور بيت	مزکی کے عہدہ میں نیشاپور کا ایک بڑا
كبير فيهم جماعة من المحدثين	خاندان مشہور ہے جس میں بڑے بڑے

الكبار[1]	محدث ہوئے ہیں۔

ابو اسحٰق ابراہیم مزکی اور ان کے صاحبزادے یحییٰ بن ابراہیم مزکی اسی خاندان کے افراد تھے۔

تزکیہ کی صورت یہ ہوتی تھی کہ جو لوگ اس عہدہ پر رکھے جاتے تھے وہ اسلامی عدالت کے گواہوں کے حالات اور معاملات کی تحقیق کرتے اور ان کے ظاہری اور باطنی امور کی بھی تفتیش کرتے، ان کے دفتروں میں علاقہ وار لوگوں کے نام، پتے اور حالات کی تفصیل بھی ہوتی اور بوقت ضرورت عدالتیں گواہوں کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کیا کرتی تھیں، علامہ مقدسی بشاری خراسان کے ذکر میں لکھتے ہیں:

ويشهد كل واحدٍ في كل شئ	اس ملک میں ہر شخص ہر معاملہ میں گواہی
غير ان في كل بلد عدة من	دیتا ہے، البتہ ہر شہر میں متعدد مزکی مقرر
المزكين، فان طعن الخصم	کرتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ اگر ایک
على الشاهد سُئل عنه المزكي	فریق دوسرے فریق کے گواہ کو جھوٹا
ولا يتخذ فيه الا فقيه او	کہتا ہے یا اس میں عیب نکالتا ہو تو اس کے
رئيس۔[2]	بارے میں مزکی سے سوال کیا جاتا ہے اور
	اس مرتبہ پر فقیہ یا رئیس فائز ہوتا ہے۔

چونکہ یہ عہدہ اس اعتبار سے بہت اہم اور ذمہ دارانہ ہوا کرتا تھا کہ عامۃ المسلمین کے بارے میں اچھے برے ہونے کی رائے قائم کی جاتی تھی اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوا کرتا تھا، اس لیے اس منصب کے لیے بہت ہی ثقہ اور معتبر حضرات منتخب کیے جاتے تھے۔

معدل معدل بھی تقریباً مزکی کے ہم معنی ہے۔ علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

---

[1] کتاب الانساب ورق ۵۲۶ [2] احسن التقاسیم ص: ۳۲۶

هذا اسم لمن عدّل و زکّی — معدل اس شخص کا نام ہے جو تعدیل و تزکیہ کرے

وقبلت شهادته عند القضاة — اور اس کی شہادت قاضیوں کے نزدیک معتبر و مقبول ہو۔

معدلین میں (۱) ابوالحسن علی بن محمد بن عبداللہ المعدّل اور (۲) ابونصر احمد بن عبدالباقی المعدل زیادہ مشہور ہیں۔[1]

مولانا یہ لقب دو لفظوں سے مرکب ہے، "مولا" اور متکلم کی ضمیر "نا"۔ مولا کے معنی یہاں پر آقا، سردار اور محترم کے ہیں۔ یہ لقب اس ترکیبی شکل میں عہد رسالت میں نظر نہیں آتا، عہد صحابہ و تابعین میں علمائے دین اور امرا کے لیے یہ رائج ہوا، چنانچہ علامہ ابن سعد نے حضرت امام حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ کے حال میں لکھا ہے:

ان انس بن مالکؓ سئل عن مسئلة فقال علیکم مولانا الحسن، فقالوا یا ابا حمزة نسئلك وتقول سلوا مولانا الحسن فقال انا سمعنا وسمع فحفظ ونسینا[2]

حضرت انس بن مالکؓ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ نے سائلوں سے فرمایا کہ تم لوگ مولانا حسنؒ کے پاس جاؤ، اس پر انھوں نے کہا کہ اے ابو حمزہ! ہم آپ سے مسئلہ پوچھتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ مولانا حسن سے پوچھو، اس پر آپ نے فرمایا کہ ہم نے اور حسن نے علم پڑھا اور سنا، مگر انھوں نے یاد رکھا اور ہم بھول گئے۔

اس روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حسن بصری کے لیے مولانا کا لقب استعمال فرمایا ہے اور سائلوں نے بھی اسے دہرایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے دور میں اس کا استعمال

[1] کتاب الانساب ورق ۵۲۶ [2] طبقات ابن سعد جلد ۷ قسم اول ص ۱۲۸

شروع ہوچکا تھا البتہ عام رواج نہیں ہوا تھا،

اسی طرح ابن ندیم نے ایک شیعی فقیہ حسن بن محبوب سراد (زراد) کے تذکرے میں لکھا ہے

من اصحاب مولانا الرضا ومحمد ابنه[1] — یہ فقیہ مولانا رضا اور ان کے صاحبزادے محمد کے شاگردوں میں سے ہے۔

امام رضا کو مولانا کے لقب سے یاد کرنا ان کے دور میں اس کے رواج کی شہادت ہے۔

البتہ اس زمانہ میں یہ لقب صرف علمائے دین کے لیے خاص نہ تھا، بلکہ خلفاء، سلاطین، امراء، وزراء اور دوسرے اکابر کے لیے بطور تعظیم کے استعمال ہوتا تھا، چنانچہ امیر مصر کافور اخشیدی متوفی ۳۵۷ھ کے تذکرے میں علامہ ابن خلکانؒ نے ابو الفضل بن سحیاس کا یہ دعائیہ جملہ نقل کیا ہے:

ادام اللہ ایام مولانا[2] — مولانا کے اقبال کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم رکھے۔

اسی طرح ابو احمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ نے ایک موقع پر صاحب بن عباد کو خطاب کرتے ہوے کہا تھا۔

تغافلت عن السقوط بحضرة مولانا — یعنی میں نے یہ لفظ دوسری طرح مولانا کے سامنے بدفالی کے خیال سے استعمال کیا ہے۔

مگر بعد میں اس کا عام استعمال علمائے دین کے لیے رہ گیا اور امراء و سلاطین کے لیے بہت کم استعمال ہوا،

مولوی علمائے دین اور ارباب عزت و شرف کے لیے مولوی کا لقب غالباً چھٹی صدی کی پیداوار ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص عجمی اور ترکی ذہن کی پیداوار ہے، صاحب غیاث اللغات نے لفظ مولوی کی تحقیق میں لکھا ہے:۔

[1] کتاب الفہرست ص ۳۰۹ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲

"مولوی بفتح میم، فتح لام منسوب بمولا یعنی خداوند است، بعد الحاق یائے نسبت
الفے کہ در آخر بود بواؤ بدل شد، زیرا کہ الف مقصورہ در آخر کلمۂ سہ حرفی بوقت نسبت
بواؤ بدل می شود۔"[1]

یعنی مولوی مولا کی طرف منسوب ہے اور نسبت کے وقت آخر کا الف واؤ سے بدل گیا ہے۔

گویا جس طرح مولانا میں مضاف مضاف الیہ کی ترکیب ہے اسی طرح مولوی میں بھی ہے، اور مولانا کے آخر میں جمع متکلم کی ضمیر ہے اور مولوی میں واحد متکلم کی جو صحیح نہیں ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر مولوی مضاف اور مضاف الیہ سے مل کر بنا ہوتا تو پھر اس کے شروع میں الف اور لام داخل نہیں ہو سکتے تھے، حالانکہ عام طور سے "المولوی" لکھا جاتا ہے، چلپی نے کشف الظنون میں جگہ جگہ مصنفین کے نام کے ساتھ المولوی لکھا ہے، چنانچہ جلال الدین رومی المولوی، اور شیخ اسمٰعیل انقروی المولوی الف اور لام کے ساتھ درج ہے[2]۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں کشف الظنون اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

ابتدا میں مولانا کی طرح مولوی کا لقب امراء وسلاطین کے لیے بھی بولا جاتا تھا، چنانچہ جب سلطان مصر محمد بن قلاؤن نے ابو الفداء کو حماۃ (شام) کی سلطنت دی تو ان کو جن القاب سے نوازا ان میں مولوی کا لقب بھی شامل تھا، ملاحظہ ہو:

المقام الشریف العالی المولوی السلطانی العمادی الملکی المؤیدی[3]

میں ابو الفداء صاحب حماۃ کے سلطانی القاب میں المولوی ہے اور الف لام کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

لفظ مولوی کی عظمت و اہمیت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ سلطان مصر محمد بن قلاؤن نے اپنے تمام امراء کو حکم دیا تھا کہ وہ الملک المؤید ابو الفداء کے القاب میں لفظ مولوی بھی

[1] غیاث اللغات لفظ مولوی [2] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۰۹ [3] تاریخ صلاح صفدی۔

استعمال کیا کریں، مگر خود محمد بن قلاؤن نے جب کبھی ابو الفداء کو خط لکھنا تو "مولوی" کا لفظ نہیں لکھتا تھا، اس لیے کہ اسی نے ابو الفداء کو حماۃ کی حکومت دی تھی، اس لقب کی عظمت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا جلال الدین رومی جیسے زبردست عالم کو مولوی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے؛

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبان پہلوی

مولانا روم خود فرماتے ہیں:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم — تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

ہماری زبان کے ایک شاعر نے کہا ہے:

علم مولیٰ ہو جسے، ہے مولوی — جیسے حضرت مولوی معنوی

آٹھویں صدی کے بعد سے مولوی کا لقب خاص طور سے علماء اور مدرسین کے لیے استعمال ہونے لگا اور اس کا رواج زیادہ تر علمائے روم میں ہوا حتی کہ بعض علماء "مولوی زادہ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ملّا، مُنلا اور مُولیٰ

ملا، منلا اور مولیٰ کے القاب بھی مولوی کے ساتھ کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں، ان کا استعمال بھی اہل علم کے لیے علمائے روم سے شروع ہوا، یہ القاب بھی بڑے باعظمت شمار کیے جاتے تھے، اور ان کا استعمال ساطین علم وفضل کے لیے ہوا کرتا تھا، کشف الظنون میں متاخرین میں سے بڑے بڑے ماہرین علم وفن اور مصنفین کے لیے یہ القاب ملتے ہیں، چنانچہ حضرت شیخ عبد الرحمن جامی کو ملا اور منلا کہا جاتا ہے، ملا جلالی اور بیضاوی کے محشی ملا عوض کے ساتھ یہ لقب لازمی طور سے بولا جاتا ہے، نیز متاخرین میں ملا محمود جونپوری، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا مبین، ملا محب اللہ بہاری، ملا مسکین اور ملا علی قاری وغیرہ مشاہیر علم وفن گذرے ہیں۔

استاذ | استاذ عجمی لفظ ہے، اس کو عربی میں عام طور سے استاذ بالذال لکھتے ہیں، غالباً اس کا استعمال تیسری صدی سے شروع ہوا ہے، ابتدا میں ہر فن وعلم کے سکھانے والے کو اس لقب سے یاد کیا جاتا تھا، بلکہ بعض امرا کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، علامہ سمعانی کتاب الانساب میں لکھتے ہیں کہ ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب بن حرث بخاری سبدمونی کا لقب استاذ ہے، وہ امیر اسمٰعیل بن احمد سامانی کے دربار میں علمی سوالات کے جوابات دیا کرتے تھے۔

عرف بالاستاذ لانه کان	آپ استاذ کے لقب سے اس لیے مشہور ہوئے
یختص بدار الامیر الجلیل	کہ امیر اسمٰعیل بن احمد سامانی کے دربار میں
اسماعیل بن احمد السامانی	لوگ ان سے ہر قسم کی باتیں دریافت کرتے
ویسئلونه فیها عن اشیاء	تھے اور وہ ان کے جوابات دیا کرتے تھے،
فیجیب فعرف بالاستاذ[1]	اسی لیے وہ استاذ کے لقب سے مشہور ہوئے

علامہ ابن جبیر نے بغداد کے خلیفہ ابو العباس احمد الناصر لدین اللہ کے حال میں لکھا ہے کہ اس خلیفہ کا ایک قیم اور امین ہے جو دار الخلافہ اور حرم کے جملہ امور کو انجام دیتا ہے، اور تمام سامان اور ضروریات کا ذمہ دار ہے،

یعرف بالصاحب مجد الدین	یہ شخص صاحب مجد الدین استاذ
استاذ الدار وهذا لقبه[2]	الدار کے لقب سے مشہور ہے۔

استاذ سبدمونی اور صاحب مجد الدین استاذ الدار کے علاوہ اور کئی اہل فن اور امراء اس لقب سے مشہور ہیں مثلاً (۱) استاذ ابو اسمٰعیل حسین بن علی بن عبد الصمد اصفہانی (۲) استاذ ابراہیم موصلی (۳) استاذ ابو اسحٰق ابراہیم بن احمد بن مہران اسفرائینی (۴) استاذ رکن شافعی فقیہ متوفی ۴۱۸ھ

[1] کتاب الانساب لفظ سبدمونی [2] رحلۃ ابن جبیر ص ۱۷۰

(۵) استاذ ابو منصور عبد القاہر بن محمد بغدادی شافعی فقیہ متوفی ۴۲۹ھ (۶) شیخ محی الدین ابو سعد محمد ابن یحییٰ نیشاپوری شافعی متوفی ۵۴۸ھ کے متعلق علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ

استاذ المتاخرین واوحدهم	وہ متاخرین کے استاذ اور علم وتقوی
علما وزهدا[1]	میں یکتا ہیں۔

(۷) استاذ ابو المنصور بغدادی (۸) امام عبد القادر بن طاہر بن محمد شافعی متوفی ۴۲۹ھ وغیرہ اس لقب سے مشہور ہیں، امرا میں استاذ کافور ابو المسک بن عبد اللہ اخشیدی زیادہ مشہور ہے، جو مصر کا امیر تھا، اور امیر کافور اخشیدی کے نام سے مشہور تھا، یہ لقب اس قدر عام تھا کہ اہل علم وفضل اور امراء وسلاطین سے لیکر گانے بجانے کے استادوں تک کو اس سے یاد کیا جاتا تھا، اور اب تک اس کی یہ عمومیت باقی ہے،

شیخ الاسلام وغیرہ | ابتدا میں شیخ کا لقب عام طور سے اہل علم وفضل کے لیے کسی خاص فن یا خاص علم یا خاص مقام وقوم کی طرف نسبت کے ساتھ یہ لفظ بولا جاتا تھا، مثلاً شیخ الحرم امام ابن ابی ملیکہ، شیخ الحرم حضرت فضیل بن عیاض، شیخ الکوفہ امام ابو عمر حکم بن عقیلہ کندی، شیخ الدیار المصریہ امام لیث بن سعد، شیخ السنۃ امام ابو بشیر ورقاء بن یشکری وغیرہ۔

پہلی صدی ہی میں شیخ کا لقب قرآن وحدیث اور فقہ کے معلمین واساتذہ کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اور اس کی جمع عام طور سے شیوخ استعمال کی گئی، اس کے بعد جب اس کا استعمال امت کے عُبّاد وزہّاد اور صلحا واولیا، کے لیے ہونے لگا تو اسکی جمع عموماً مشائخ استعمال ہونے لگی۔

عہد تابعین وتبع تابعین میں شیخ کی نسبت مقام وفن سے ترقی کرکے اسلام کی طرف بھی ہونے لگی، اور اعیان علم وفضل اور ائمۂ وقت کے لیے شیخ الاسلام کی ترکیب رائج ہوئی۔

[1] ان حضرات کے تذکرہ کے لیے تاریخ ابن خلکان ملاحظہ ہو۔

علامہ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں اس کو استعمال کیا ہے، اور (۱) شیخ الاسلام حضرت عبداللہ بن مبارک (۲) شیخ الاسلام امام حماد بن سلمہؒ (۳) شیخ الاسلام ابوبسطام شعبہ بن حجاجؒ (۴) شیخ الاسلام امام مالکؒ (۵) شیخ الاسلام امام سفیان ثوریؒ[1] رحمہم اللہ کے لیے یہ لقب ملتا ہے۔

ابتدائی دور میں یہ لقب حقائق پر مبنی ہوا کرتا تھا اور جن بزرگانِ دین اور ائمۂ اسلام کے لیے استعمال ہوتا تھا وہ اس کے اہل ہوا کرتے تھے، مگر بعد میں اس میں افراط و تفریط ہونے لگی اور ایسے لوگوں کو یہ لقب دیا جانے لگا جو اس کے اہل نہیں تھے، پانچویں صدی کا واقعہ ہے جس کو علامہ ابن خلکان نے شیخ الاسلام ابوالحسن علی بن احمد بن یوسف ہکاری متوفی ۴۸۶ھ کے تذکرے میں لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں،

وسمعت ان بعض الاکابر	میں نے سنا ہے کہ بعض اکابر نے امام ہکاری سے
قال له انت شیخ الاسلام	کہا کہ آپ شیخ الاسلام ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ
فقال انا شیخ فی الاسلام[2]	میں شیخ الاسلام (اسلام کا شیخ) نہیں ہوں
	البتہ شیخ فی الاسلام (اسلام میں ایک شیخ) ہوں،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ہکاری کے نزدیک اس لقب کی کیا عظمت و اہمیت تھی اور وہ اپنی ذات کو اس لقب کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

چھٹی صدی میں شیخ الاسلام کی طرح شیخ الشیوخ کا ایک لقب جاری ہوا اور اسکی ترویج زاویوں اور خانقاہوں سے یوں ہوئی کہ مصر میں خانقاہوں کی تولیت و مشیخت کے لیے علماء و فقہاء اور محدثین کا انتخاب ہوتا تھا، اور علماء و صوفیا کی تعلیم و تربیت سے لیکر خانقاہوں کے جملہ انتظامات تک ان کے سپرد ہوتے تھے، چنانچہ قاہرہ کی خانقاہ صالحیہ کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

[1] ان حضرات کے تذکرے کے لیے تذکرۃ الحفاظ ملاحظہ ہو۔ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۰۷

نے ایک شیخ کو مقرر کیا اور ان کا لقب شیخ الشیوخ رکھا، اس کے بعد سے خانقاہوں کے ہر شیخ کو شیخ الشیوخ کہنے لگے،[1] خانقاہ صالحیہ کے شیخ الشیوخ قاضی القضاۃ تقی الدین عبدالرحمنؒ جیسے یگانۂ روزگار بھی رہ چکے ہیں، خانقاہ بشتاک کے شیخ الشیوخ ۷۳۶ھ میں حضرت شہاب الدین مقرر کیے گئے، خانقاہ شیخو کے شیخ الشیوخ حضرت شیخ اکمل الدین محمد بن محمود تھے، سریاقوس کی خانقاہ سلطان الملک الناصر محمد بن قلاوون نے ۷۲۵ھ میں بنوائی، اور اس میں شیخ مجد الدین موسیٰ ابن احمد بن محمود اقصرائی کو شیخ الشیوخ مقرر کیا، اس سے پہلے خانقاہ سعید السعداء کے شیخ کو شیخ الشیوخ کہا جاتا تھا، خانقاہ ارسلان کے شیخ الشیوخ حضرت تقی الدین ابوالبقاء محمد بن جعفر ابن محمد بن عبدالرحیم حسینی قنائی شافعی متوفی ۸۰۴ھ مقرر کیے گئے، اس کے شیخ الشیوخ قاضی القضاۃ صدر الدین عبدالوہاب بن احمد اخنائی متوفی ۷۸۹ھ اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ شمس الدین محمد بھی رہ چکے تھے، اسی طرح خانقاہ بکتمر (جس کی تعمیر ۷۲۶ھ میں ہوئی) کے پہلے شیخ الشیوخ شمس الدین رومی تھے، خانقاہ قوصون (جسکی تعمیر ۷۳۶ھ میں ہوئی) کے شیخ الشیوخ شمس الدین ابوالثنا محمود بن ابوالقاسم احمد اصفہانی منتخب ہوئے، انکو اس خانقاہ کی طرف سے سالانہ تنخواہ کے علاوہ کھانا، صابون، تیل حتیٰ کہ ان کے سائیس کا کپڑا بھی ملتا تھا، اور یہ تمام چیزیں ان کے بعد ہر شیخ الشیوخ کے لیے جاری رہیں، خانقاہ طغائی نجمی کے شیخ الشیوخ حضرت برہان الدین رشیدیؒ تھے، اور خانقاہ خروبیہ میں امام شمس الدین محمد بن حمتی دمشقی حنبلی کو شیخ الشیوخ مقرر کیا گیا تھا،[2]

اخیر دور میں ترکی میں مشیخۃ الاسلام کا ایک خاص عہدہ مقرر ہوا، اور وقت کے جلیل القدر عالم کو اس عہدہ پر فائز کر کے "شیخ الاسلام" کے لقب سے پکارا جانے لگا، یہ منصب سرکاری ہوتا تھا اور سلطان کے بعد سب سے بڑا مرتبہ شیخ الاسلام سمجھا جاتا تھا، ہندوستان میں آجکل شیخ الحدیث، شیخ التفسیر، شیخ الفقہ اور شیخ الادب کا اطلاق ان علوم و فنون کے پڑھانے والے مدرسین پر

[1] کتاب الخطط والآثار مقریزی ج ۴ ص ۲۷۳ [2] ایضاً ج ۴ ص ۲۷۵، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۹۰، ۲۸۹، ۲۹۲

ہوتا ہے، یہ اصطلاح خالص ہندوستانی معلوم ہوتی ہے، شیخین (تثنیہ) کی اصطلاح امت مسلمہ کی برگزیدہ ہستیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، مثلاً حضرات خلفاے راشدین میں شیخین حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما، محدثین میں امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ، ائمۂ احناف میں امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ ہیں۔

قطب الدین اور شمس الدین وغیرہ قطب الدین، شمس الدین وغیرہ دین کی نسبت کے القاب بہت بعد کی پیداوار اور اس ذہن کا نتیجہ ہیں جو اسلامی علوم ومعارف پر عجمی خیالات وتصورات کے رنگ میں چوتھی صدی ہجری اور اس کے بعد سے چھانے لگا تھا، صدر اسلام سے لیکر صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کے دور تک علماء وامراء کے لیے اس قسم کے القاب کا کوئی نشان نہیں ملتا، مگر پانچویں صدی کے بعد سے اس کی بھرمار ہوگئی، طوائف الملوکی کے امیروں، مذاہب کے عالموں اور طریقت کے مشائخ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو "الدین" کی نسبت کے لقب سے ملقب نہ ہو۔

تیسری صدی تک جس طرح ارباب علم وفضل اب، ابن، ام کی نسبت، یا مقام وفن کی نسبت یا کسی مخصوص عرفیت کے ساتھ مشہور ہوا کرتے تھے، اسی طرح پانچویں صدی کے بعد سے ان کے لیے دین کی طرف نسبت سے ان کی شہرت ہونے لگی، اس کے مقابلہ میں خال خال لوگ کنیت، نسبت اور عرفیت سے مشہور ہوئے، اس سلسلہ میں علامہ محمد بن جبیر اندلسی متوفی ۶۱۴ھ کی تصریحات ملاحظہ فرمائیے، جنھوں نے چھٹی صدی کے وسط میں اندلس سے بلاد مشرق کا سفر کرکے اپنا سفرنامہ مرتب کیا، ملک شام کے شہر دنیصر کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

وصاحب هذه البلدة قطب	دنیصر کا مالک قطب الدین ہے، نیز یہ
الدین، وهو ایضاً صاحب مدینة	دارا، اور ماردین اور راس العین
دارا، ومدینة ماردین،	کا بھی مالک ہے، یہ بادشاہ اپنا بالکل

ورأس العین، وهو قریب لابنی	کا قریبی رشتہ دار ہے، یہ علاقہ مختلف بادشاہوں
بابك. وهذه البلاد لسلاطین	کا ہے، جیسے اندلس میں طوائف الملوکی
شتی کملوك طوائف الاندلس	کے بادشاہ ہیں، یہ سب کے سب القاب کے ایسے
کلهم قد تحلّی بحلیة تُنسب الی	زیور سے آراستہ ہوتے ہیں جن کی نسبت دین
الدین. فلا تسمع الا القاباً	کی طرف ہوتی ہے، تم کو ہر طرف پرشکوہ القاب
هائلة وصفات لذی التحصیل	اور بے جوڑ صفات سننے میں آئیں گی،
غیر طائلة، قد تساوی فیها السوقة	ان القاب وصفات میں عوام اور بادشاہ
والملوك واشترك فیها الغنی و	برابر ہوتے ہیں، اور امیر وغریب میں فرق
الصعلوك، لیس فیهم من اتسم	نہیں ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ان میں سے
بسمة به تلیق، او اتصف بصفة	کسی صفت کا قائل نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کے
هو بها خلیق الا صلاح الدین	لائق ہوتا ہے، البتہ شام ومصر اور حجاز
صاحب الشام ودیار مصر والحجاز	ویمن کا بادشاہ صلاح الدین ایوبی جو کہ
والیمن، المشتهر بالفضل و	بزرگی اور انصاف میں مشہور ہے، یہ نام
العدل فهذا اسم وافق مسماه	اس کی ذات کے موافق اور یہ لفظ
ولفظ طابق معناه، وما سوی	صحیح معنی کے مطابق ہے، اسکے علاوہ
ذالك فی سواه فزعازع ریح	ہوا کے جھونکے، مجروح شہادتیں اور
وشهادات یردها التجریح ودعوی	دین کی نسبت کے بے کیف وکم
نسبة للدین برحت به التبریح	دعوے ہیں اور ان پر یہ شعر صادق آتا ہے
القاب مملکة فی غیر موضعها	حکومت وسلطنت کے القاب کا بیجا استعمال جس پر ہوتا ہے وہ
کالهر یحکی انتفاخاً صولة الاسد[1]	اس بلی کے مانند ہے جو بھاری بھرکم بن کر شیر کے حملہ کی نقل کر

[1] رحلۃ ابن جبیر اندلسی طبع مصر ص [illegible]

علامہ ابن جبیرؒ اہل دمشق کے یہاں مردوں کی تجہیز و تکفین کے مراسم میں لکھتے ہیں کہ جب تعزیت کے لیے اعیان و اشراف آتے ہیں اور اپنے اپنے القاب کے ساتھ پکارے جاتے ہیں تو ان القاب کا استعمال اس طرح ہوتا ہے:

ونقباء الجنائز يرفعون اصواتهم بالنداء لكل واصل للعزاء من محتشمي البلدة واعيانهم ويحلونهم بخططهم الهائلة التي قد وضعوها لكل واحد منهم بالاضافة الى الدين فتسمع ماشئت من صدر الدين او شمسه او بدره او نجمه او زينه او بهائه او جماله او مجده او فخره او شرفه او معينه او محييه او زكيه او نجيبه الى ما لا غاية له من هذه الالفاظ الموضوعة ولا سيما في الفقهاء بما شئت ايضاً من سيد العلماء وجمال الائمة وحجة الاسلام

جنازے کے نقیب تعزیت میں آنیوالے شہر کے اعیان و اشراف کے نام بلند آواز سے پکارتے ہیں اور دین کی نسبت کے جو پرشکوہ القاب ہر ایک کے ہوتے ہیں ان کا مظاہرہ کرتے ہیں، چنانچہ تم اس طرح کے بے انتہا بنائے القاب سن سکتے ہو جیسے صدر الدین، شمس الدین، بدر الدین، نجم الدین، زین الدین، بہاء الدین، جمال الدین، مجد الدین، فخر الدین، شرف الدین، معین الدین، محیی الدین، زکی الدین، نجیب الدین وغیرہ، اور ہر طبقہ خصوصاً فقہا میں دوسرے شاندار قسم کے بے موقع اور بے محل القاب پاؤ گے، مثلاً سید العلماء، جمال الائمہ، حجۃ الاسلام، فخر الشریعۃ، شرف الملۃ، مفتی الفریقین، وغیرہ،

وفخر الشريعة، وشرف الملة، ومفتي الفريقين الى ما لا نهاية له من هذه الالفاظ المحالية[۱]

والدین کی نسبت کے القاب کا رواج اس قدر زیادہ اور عام ہوگیا کہ بہت سے علماء کے اصل نام پر پردہ پڑ گیا، چنانچہ شیخ جلال الدین رومیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، امام فخر الدین رازیؒ اور اسی طرح کے بہت سے مشہور علماء کے اصل نام کتابوں کی مراجعت کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔

آخر میں ان القاب سے عوام و خواص کی اس قدر دلچسپی بڑھ گئی کہ لوگوں نے ان کو مستقل نام بنالیا اور یہ صورت آج تک قائم ہے جس کی وجہ سے ان القاب کی عظمت و اہمیت ختم ہوگئی، اور ہر چھوٹے بڑے، جاہل اور عالم کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

صاحب صاحب کا لفظ ابتدا میں عام طور سے تلمیذ اور شاگرد کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اس کی جمع اصحاب تلامذہ کے معنی میں آتی تھی، جیسے عبد الرحمن بن ہرمز الاعرج متوفی ۱۱۷ھ صاحب ابی ہریرہؓ، اشعث بن عبد الملک متوفی ۱۴۶ھ صاحب الحسن بصریؒ، معمر بن راشد متوفی ۱۵۳ھ صاحب عبد الرزاق، غندر متوفی ۱۹۴ھ صاحب شعبہؒ، اور اصحاب ابی حنیفہؒ، اصحاب شافعیؒ، اور اصحاب مالکؒ وغیرہ، اس کے مقابلہ میں استاذ کے لیے شیخ اور شیوخ بولا جاتا تھا،

صاحب کے لفظ کے ذریعہ علماء کے خاص خاص علوم و فنون کو بھی ظاہر کیا جاتا تھا، مثلاً محمد بن اسحاق صاحب المغازی، ابو صالح صاحب التفسیر، امام زفر صاحب الرائے وغیرہ، اسی طرح محدثین کو اصحاب الحدیث اور فقہا کو اصحاب الرائے کہتے تھے،

اور اس کے ذریعہ علماء کی نسبت ان کی اہم تصنیفات کی طرف بھی کیجاتی تھی، مثلاً بخاریؒ

[۱] رحلہ ابن جبیر اندلسی طبع مصر ص ۲۲۷

صاحب الصحیح، حمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین، خطیب صاحب تاریخ بغداد، میدانی صاحب مجمع الامثال وغیرہ،

بعض مرتبہ اس کے ذریعہ مقامات و بلاد کی نسبت بھی ظاہر کیجاتی تھی، مثلاً محمد بن عبادہ صاحب قرطبہ اور عزالدین مسعود صاحب موصل وغیرہ۔

صاحب کے لقب کو نسبت اور شاگردی کے مفہوم سے الگ کرکے سب سے پہلے ابوالقاسم اسمٰعیل بن عباد کے لیے استعمال کیا گیا، وہ مؤید الدولہ بن بویہ کا معتمد و منصرم تھا، مؤید الدولہ ابن بویہ کی صحبت و ہمنشینی کی وجہ سے اس کو یہ لقب ملا اور صاحب بن عباد مشہور ہوا، غالباً اس وقت سے امراء و خلفاء کے دربار و حرم سرا کے امور و معاملات کے امین و قیم کو صاحب کہنے لگے، کیونکہ ہر وقت اس کی صحبت و معیت میں رہتے تھے، اور ان کو باہر نکلنے تک کی فرصت نہیں ملتی تھی، جیسا کہ ابن جبیر نے خلیفہ بغداد کے امین و قیم کے متعلق لکھا ہے کہ

یعرف بالصاحب مجد الدین	یعنی یہ شخص صاحب مجدالدین استاذ
استاذ الدار وهذا اللقب	الدار کے لقب سے مشہور ہے، اور خلیفہ کے
ویدعی له اثر الدعاء للخلیفة	حق میں دعا کرنے کے بعد ہی اس کے لیے
وهو قل ما یظهر للعامة اشتغالاً	دعا کی جاتی ہے، یہ شخص عوام میں بہت کم
بما هو بسبیله من امور تلک	آتا ہے کیونکہ وہ شاہی مکانات کے معاملات
الدیار وحراستها والتکفل	اور ان کی نگرانی اور تحقیق و تلاش
بمعالقها وتفقدها لیلاً ونهاراً[1]	میں رات دن مشغول رہتا ہے۔

پھر صاحب کا لفظ علماء اور دوسرے اعیان و اکابر کے ناموں کے شروع میں اضافت کے ساتھ استعمال ہونے لگا جیسے صاحب الفضیلة، صاحب العزة، اور صاحب الجلالة وغیرہ،

[1] رحلۃ ابن جبیر ص ۱۲۵

پھر ناموں کے آخر میں بغیر اضافت کے اس کا استعمال اخیر دور کی پیداوار ہے اور اس کا رواج غالباً ہندوستان میں زیادہ ہوا، کیونکہ تاریخ و رجال کی کتابوں میں دوسرے ملکوں کے متاخرین کے نام کے آخر میں یہ لفظ نہیں ملتا، البتہ نسبت کے ساتھ غیر ممالک میں آج بھی جاری ہے اور ہندوستان میں عام طور سے مضاف الیہ حذف کردیا جاتا ہے۔

جناب ناموں کے شروع میں جناب کا استعمال بالکل نیا ہے، عربی کے قدیم محاورے میں اس لفظ کا اطلاق اس طریقہ پر کسی دور میں نہیں ملتا، البتہ قرون وسطی میں اعیان و اشراف کے ناموں کے شروع میں اس کی عظمت و اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اس کا استعمال ہوا جیسے الی الجناب العالی اور الی جنابکم، مگر اس کا رواج عام طور سے امراء و سلاطین اور وزراء وغیرہ کے لیے ہوتا تھا، کیونکہ یہ لفظ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے ان ہی لوگوں کے لیے مناسب تھا، جناب کے لغوی معنی یہ ہیں:

الجناب بالفتح الفناء وما	جناب بفتح الجیم دروازہ کے باہر کا صحن
قرب من محلة القوم[1]	اور محلہ کے آس پاس کی جگہ کو کہتے ہیں۔

گویا ابتداءً میں جناب کا لفظ دربار اور ڈیوڑھی کے لیے استعمال ہوا مگر ہمارے یہاں ناموں کی ابتداء میں اس کا رواج محترم اور گرامی قدر کے معنی میں ہوتا ہے۔

حضرت اور حضور حضرت اپنے لغوی معنی میں ہر دور میں بولا جاتا تھا، اور آج بھی عربی میں اس کا استعمال اس طرح ہوتا ہے، اور اس کے معنی موجودگی، سامنے اور خدمت کے لیے جاتے ہیں، مگر ناموں کے شروع میں تعظیم و تکریم کے طور پر تیسری صدی کے بعد استعمال ہونے لگا، اسکی ابتدا غالباً امراء، وزراء اور خلفاء و سلاطین سے ہوئی، جیسا کہ مولانا کے بیان میں گذر چکا ہے کہ ابواحمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ نے ایک موقع پر صاحب بن عباد سے مشہور جملہ سقطت علی الخبیر

[1] مختار الصحاح

کے بجائے "المجیر صادقت" کہا، صاحب بن عباد نے اس پر اعتراض کیا تو ابو احمد نے جواب میں کہا: "تقاعلت عن السقوط بحضرۃ مولانا"[1] حضور کا بطور تنظیم استعمال بعد کی بات ہے،

خاص خاص القاب مذکورہ بالا القاب و خطابات عمومی ہیں اور ان کا اطلاق عام طور پر ہوتا ہے، انکے علاوہ ایسے القاب بھی ہیں جو خاص خاص علمائے دین اور اربابِ علم و فضل کے لیے استعمال ہوئے اور ان ہی تک محدود رہے، جیسے

ترجمان القرآن، ربانی الامت، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما،

حکیم الامت، حضرت ابو درداءؓ اور حضرت ابو مسلم خولانیؒ،

باقر، امام محمد بن علی ابو جعفرؒ

زین العابدین، امام علی بن حسینؒ

صادق، امام جعفر بن محمدؒ

فقیہ الامت، امام مالکؒ

فقیہ العراق، امام ابراہیم نخعیؒ

فقیہ المدینہ، امام ابو الزنادؒ اور حضرت امام سعید بن مسیبؒ

مسند العراق، امام علی بن عاصم واسطیؒ

مفتی المدینہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

مفتی مصر، امام مرثد بن عبداللہؒ

امام اعظم، امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ

اسد السنۃ، امام اسد بن موسیٰؒ

خیاط السنۃ، امام زکریا سجستانیؒ

امام الحرمین، امام ابو المعالی عبدالملک بن عبداللہ جوینی شافعیؒ

جار اللہ، علامہ ابو القاسم محمود بن عمر زمخشریؒ وغیرہ۔

---

[1] مقدمہ کتاب المصون فی الادب ص ۵ طبع کویت

آزاد بلگرامی

از جناب عبدالرزاق صاحب قریشی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

(۲)

ا ذوالقعدہ ۱۱۵۲ھ (۳۰ نومبر ۱۷۳۹ء) کو آزاد دکن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲ ذیقعدہ کو اورنگ آباد پہنچے، اورنگ آباد میں انھوں نے بادشاہ مسافر نقشبندیؒ کے تکیہ میں قیام فرمایا، اس خانقاہ میں انھوں نے مختلف اوقات میں سات سال گذارے، پہلی بار تقریباً دو سال قیام کرنے کے بعد ۲ رمضان المبارک ۱۱۵۴ھ (۲ اکتوبر ۱۷۴۱ء) کو اورنگ آباد سے نکلے اور قلعۂ محمد آباد، بیدر، بنگلہ(؟) خاندیش، برار وغیرہ کی سیاحت کے بعد اس شہر میں پہنچے جو سلاطین بہمنیہ کا دار السلطنت رہ چکا ہے، اس شہر کے متعلق آزاد لکھتے ہیں کہ آجکل خستہ حالت میں ہے، اور شاہی عمارتوں کے کھنڈر آنکھ رکھنے والوں کے لیے عبرت کا سامان مہیا کرتے اور دنیا کی ناپائیداری کا مرثیہ پڑھتے ہیں، ۱۴ محرم الحرام ۱۱۵۵ھ (۳۰ جنوری ۱۷۴۲ء) کو وہ حیدر آباد پہنچے، حیدر آباد کے متعلق انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عمارتوں کی کثرت، سڑکوں کی کشادگی، پانی کی فراوانی اور درختوں اور کھیتوں کی شادابی کے لحاظ سے کم شہر ایسے دیکھنے میں آئے، ۱۹ صفر تک وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۵ جمادی الاول کو وہ اورنگ آباد لوٹے،[2]

۱۱۵۸ھ ۱۷۴۵ء میں نواب آصف جاہ نظام الملک نے اپنے صاحبزادہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ

[1،2] ان حالات کے لیے ملاحظہ ہو ماثر الکرام ص ۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، آزاد: سرو آزاد ص ۲۹۴، ید بیضا

کو اورنگ آباد کی صوبہ داری پر مامور کیا، ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں آزاد کی ان سے ملاقات ہوئی[1]، اس ملاقات کی تقریب کے سلسلہ میں شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد نے ایک دن انھیں بتایا کہ حجاز سے لوٹنے کے بعد میں سورت ہوتا ہوا اورنگ آباد پہنچا، یہاں میں نے دس سال توکل میں گذار دیے، اب میری عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی تھی، قوائے جسمانی میں انحطاط آچکا تھا، اور میں لازمی ضرورتوں کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج پانے لگا، میں نے دیکھا کہ اب توکل سے کام نہیں چل سکتا، انہی دنوں میں نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید نے مجھ سے خواہش رفاقت ظاہر کی، میں نے اسے قبول کر لیا[2]، شفیق کہتے ہیں کہ اس کے بعد آزاد نے فرمایا کہ نواب موصوف کی رفاقت اختیار کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ کسی ایک شخص کی ملازمت میں رہنا توکل اختیار کرنے سے بہتر ہے، کیونکہ ایک ہی شخص پر نظر رکھنا بہ نسبت ہزار لوگوں پر نظر رکھنے کے بہتر ہے، جب نظر ہر طرف سے ہٹ کر ایک ہی شخص پر جم جاتی ہے تو جمعیت دل اور سکون خاطر نصیب ہوتا ہے اور ہر کام خواہ دینی ہو یا دنیوی بلاتشویش خاطر انجام پاتا ہے، انہی خیالات کا اظہار آزاد نے مندرجۂ ذیل اشعار میں بھی کیا ہے:

توکل را نظر ہر روز بر تو خدمتی باشد   ہماں بہتر کہ ایں کس یار صاحب دولتی باشد

اگر مستی میاں را در کشا دکار محتاجاں   تقرب با خداوندان دولت طاعتی باشد

سواد فقر را از پرتو دولت چراغاں کن   ترا زیں جامعیت با سلیماں نسبتے باشد[3]

توکل کے متعلق آزاد کی یہ تاویل کہ ایک ہی شخص پر نظر رکھنا بہ نسبت ہزار لوگوں پر نظر رکھنے کے بہتر ہے، ممکن ہے قابل قبول ہو (حالانکہ توکل تو حقیقت میں خدا کے سوا اور کسی پر نظر نہ رکھنے کا نام ہے) لیکن سواد فقر کو پرتو دولت سے روشن رکھ کر سلیمان سے نسبت پیدا کرنے کی تلقین کی صورت میں قابل قبول قرار نہیں پا سکتی۔

---

[1] آزاد: سبحۃ المرجان ص ۱۰۲ [2] شفیق: گل رعنا [3] ایضاً

نواب نظام الدولہ کو آزاد سے ربط خاص پیدا ہو گیا تھا۔ اگلے سال نواب آصف جاہ نے نواب نظام الدولہ کو حیدر آباد طلب کیا تو نواب نظام الدولہ نے آزاد کو مجبور کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ حیدر آباد چلیں، آزاد نواب کے حسن اخلاق اور اصرار سے مجبور ہو کر، ۲۰ ذیقعدہ ۱۱۵۹ھ (یکم اکتوبر ۱۷۴۶ء) کو اورنگ آباد سے نکلے اور سری رنگ پٹن تک کی جو مہاراجہ میسور کی عملداری میں تھا، سیاحت کی، صفر ۱۱۶۱ھ (جنوری ۱۷۴۸ء) میں وہ اورنگ آباد واپس آ گئے، اسی سال کے دوران میں انھوں نے روضۃ الاولیا تصنیف کی[1]۔ یہ کتاب خلد آباد کے اولیائے کرام کے حالات پر مشتمل ہے، اسی سال وہ برہان پور کی سیر کو گئے،

اسی سال رمضان کے مہینہ میں آزاد کو دوبارہ دیار عرب جانے کا خیال ہوا، وہ لکھتے ہیں:

"در عشرۂ اخیر رمضان ۱۱۶۱ھ (اگست ۱۷۴۸ء) مزاج بندہ را وحشتی بہم رسید۔ بخاطر افتاد کہ از ہمہ قطع نظر باید کرد و بار دیگر سری بدیار عرب باید کشید"[2]

لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا، اس کا سبب یہ تھا،

"ناگاہ شب بیست و ہفتم ماہ مذکور طرف سحر در عالم رویا اندیشہ متوجہ شعر گردید، بیتی موزوں ساختم و حقاً از خواب بیدار شدم، بیت بیاد ماندہ آں اینست:

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار   مکش دست از دامن روزگار

لختی بتامل رفتم، دانستم کہ گویندہ سروش غیبی است و مخاطب بندہ، امتثال امر غیب واجب دیدم و ارادہ کہ تصمیم یافتہ بود فسخ نمودم و میسر الہام آنست کہ حجی کہ فرض بود پیش ازیں بتقدیم رسید، اگر دست از دامن علائق ظاہری می کشیدم و بہ تحصیل نافلہ می شتافتم چندیں حقوق واجب الادا فوت می شد۔

ترک واجب نتواں کرد پی نافلۂ"[3]

---

[1] آزاد بلگرامی: روضۃ الاولیا (اورنگ آباد ۱۳۱۰ھ) ص ۱۱ [2] آزاد: سرو آزاد ص ۲۹۲ [3] ایضاً

۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸-۴۹ء میں آزاد دوبارہ برہان پور گئے، اسی سال ۱۴ر شوال کو ارکاٹ کے لیے روانہ ہوئے، اور ایک سال اور چند مہینے اس دیار میں گذارے، شمامۃ العنبر فی ما ورد فی الہند من سید البشر انھوں نے یہیں تالیف کی، تفسیر و حدیث کی کتابوں میں ہند کا جو ذکر آیا ہے، اس کو اس رسالہ میں جمع کیا ہے۔ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء میں نواب نظام الدولہ کی شہادت کے بعد وہ اورنگ آباد چلے آئے، اگلے سال "فلک ہمیشہ خرام" نے پھر سامان سفر پیدا کر دیا، نواب نظام الدولہ کی شہادت کے بعد "شاہ نواز خان بہادر بتقرب جوار خویش مکانی جہت بود و باش این درویش صفا کیش مقرر ساختہ"[1] ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں حیدر آباد گئے تو انھیں بھی ساتھ لے گئے، ۹ر رجب کو وہ اورنگ آباد سے نکل کر، ۸ر شعبان کو حیدر آباد پہنچے، ۱۶ر ذیقعدہ کو وہاں سے چل کر ۵ر ذی الحجہ کو اورنگ آباد واپس آئے۔[2]

بیت اللہ جانے سے پہلے آزاد نے اپنے وطن (بلگرام) کے علماء و فضلاء اور فقراء و شعراء کے حالات میں ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اور اس کا کچھ حصہ لکھ بھی چکے تھے، لیکن ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے چلے گئے، اس لیے یہ کام ادھورا رہ گیا، حرمین سے لوٹنے کے بعد جب دکن میں مستقل قیام کیا تو نامکمل مسودہ کو وطن سے منگوا کر اس کی تکمیل میں لگ گئے، اور اس تذکرہ کو انھوں نے دو جلدوں میں (مآثر الکرام اور سرو آزاد) ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں مکمل کیا۔[3] "خزانۂ مسک" سے مآثر الکرام کی اور "نشانۂ آزاد سرو سبز تازہ" سے سرو آزاد کی تاریخ نکالی تھی،[4] مآثر الکرام دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں ۸۰ فقرا کے اور دوسرے حصہ میں ۷۳ علما کے حالات ہیں، سرو آزاد بھی دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں ۱۴۳ فارسی شعرا اور دوسرے حصہ میں ۸ ہندی شعرا کا تذکرہ ہے، یہ دونوں کتابیں حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہیں۔

[1] تحفۃ الشعراء قلمی، کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد [2] آزاد: سرو آزاد ص ۲۹۴، ۲۹۵
[3] آزاد: مآثر الکرام ص ۳ [4] ایضاً ۱۱ و سرو آزاد ص ۴

ان تذکروں کے جواب میں آزاد کے ایک ہم وطن شیخ غلام حسن ثمین صدیقی نے شرائف عثمانی لکھی جس میں آزاد کی تاریخی غلطیوں کی طرف اشارے اور شیوخ بلگرام کا تذکرہ ہے، اس کا مختصر سا ذکر ہم ابتدائے مضمون میں کر آئے ہیں، ایک دوسری کتاب جو مآثر الکرام اور سرو آزاد کی تنقید میں لکھی گئی، "تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد" (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) ہے، یہ بلگرام کے ایک غیر معروف شاعر محمد صادق بن محمد احسن اللہ متخلص بہ سخنور کی تالیف ہے، اس میں تاریخی غلطیاں نہیں بتائی گئی ہیں، بلکہ آزاد کے اسلوب بیان اور شاعری پر تنقید کی گئی ہے، چونکہ یہ کتاب ذاتی مخاصمت کی بنا پر لکھی گئی ہے، اس لیے اس کا لہجہ بہت درشت ہے، اس کے جواب میں آزاد کے ایک شاگرد عبد القادر سمرقندی دہلوی نے تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق لکھی، اس کے لہجہ میں متانت و معقولیت پائی جاتی ہے۔[1]

۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں نواب امیر الممالک سید محمد خاں خلف نواب آصف جاہ نے نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کو جو اورنگ آباد میں تھے، اپنا وکیل متعین کیا، جب وہ نواب امیر الممالک سے ملنے حیدر آباد گئے تو انھوں نے بڑے اشتیاق سے آزاد کو بھی حیدر آباد بلوایا، وہاں سے آزاد ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں اورنگ آباد لوٹے،[2] اسی سال بلگرام میں ان کے اکلوتے صاحبزادہ نور الحسن ایک تالاب میں غسل کرتے وقت عین شباب میں غرق ہو گئے، آزاد نے ان کا نہایت درد انگیز مرثیہ لکھا ہے:

قیامت بر سر این بوستان رفت   کہ یک گل داشت آن ہم نوجوان رفت[3]

اس کے بعد کے حالات کی تفصیل ہمارے پاس نہیں، ممکن ہے کہ کہولت سن کی وجہ سے آزاد نے سیر و سیاحت کا سلسلہ ختم کر دیا ہو، شفیق ان کے مذکورہ بالا آخری سفر حیدر آباد

[1] ایوانو: فہرست مخطوطات فارسی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ ۱۹۲۴ء) ص ۱۱۲ [2] شفیق: گل رعنا
[3] سید مقبول احمد: حیات جلیل، حصہ دوم ص ۱۷۴

کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"تا حالتِ تحریر (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء - ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء) در ہمیں گل زمین (اورنگ آباد) وسادہ آرائی افتادہ اند"[1]

خود آزاد کے مندرجۂ ذیل بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے:

"چند بار بتماشائے اطراف ملک دکن برخاستم. اکنوں در دار الامن اورنگ آباد گوشہ گیرم"[2]

ولیم چیمبرز آزاد کے ایک ہم عصر تھے، انھوں نے خزانۂ عامرہ کے بعض حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، ترجمہ کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"(آزاد) اس وقت تک اورنگ آباد دکن میں بقید حیات ہیں اور سالہاسال تک علمی و ادبی مشاغل اور سیر و سیاحت میں مصروف رہنے کے بعد اب عزت و احترام اور کسی قدر شان کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں، اس وقت ان کی عمر ۸۵ برس ہے، موجودہ نظام دوبار ان سے ملنے اورنگ آباد آچکے ہیں، مترجم (ولیم چیمبرز) کے پاس اس خط کی جو غازی الدین خاں نے انھیں ۱۷۷۵ء میں لکھا تھا، ایک نقل موجود ہے، اس خط میں غازی الدین خاں نے آزاد کی بڑی مدح و ستایش کی ہے"[3]

اپنے سیر و سفر پر آزاد نے یہ مختصر مگر بلیغ تبصرہ کیا ہے:

"حق سبحانہ علیم است کہ بلال دار مقصود از ایں سیر و سفر تن پروری باشد حاشا وکلا بلکہ مانند بدر تنگشت بود"[4]

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ آزاد نے شعرائے فارسی کے دو تذکرے (ید بیضا اور سرو آزاد) لکھے، لیکن یہ تذکرے کسی مخصوص نقطۂ نگاہ سے نہیں لکھے گئے تھے، آزاد کے بھتیجے میر اولاد محمد

[1] شفیق: گل رعنا [2] آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۱۲۵ [3] سی۔ اے۔ اسٹوری: پرشین لٹریچر (لندن ۱۹۵۳ء) جلد اول حصہ دوم ص ۸۵۷-۸۵۸ [4] آزاد: سرو آزاد ص ۲۹۵

نے ان سے خواہش کی کہ اب وہ ایک ایسا تذکرہ ترتیب دیں جس میں صرف ان شعرا کے حالات ہوں جنھوں نے ارباب کرم کی مدح گستری کی ہو اور اپنے ممدوحین سے صلہ پایا ہو، آزاد بھتیجے کو بہت عزیز رکھتے تھے، اس لیے آمادہ ہو گئے، اس طرح خزانۂ عامرہ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء میں وجود میں آیا، خود آزاد نے قطعۂ تاریخ کہا تھا:

آزاد رقم نمود نو تذکرۂ — در جیب ورق ریخت نقود سرۂ
گنجور خرد گوہر تاریخ فشاند — حق دادہ عجب خزانۂ عامرۂ[1]

اس تذکرہ میں ایران و ہندوستان کے ۱۳۵ شعرا کے ذکر کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ، نظام الدولہ ناصر جنگ، امیر الممالک سید محمد خاں اور بعض دوسرے معاصر امرا کے حالات اور مرہٹوں اور ابدالی کی جنگ کی روداد بھی عمدگی سے لکھی گئی ہے، یورپین مورخین اس کے مستند تاریخی مواد کی وجہ سے اس کی قدر کرتے ہیں، یہ تذکرہ ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور، کانپور میں طبع ہوا تھا۔

۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں آزاد نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان (عربی) تصنیف کی، یہ کتاب چار فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل احادیث و تفاسیر میں ہندوستان کے ذکر سے متعلق ہے، حقیقت میں شمامۃ العنبر کو جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، پہلی فصل کے طور پر شامل کر لیا ہے، دوسری فصل علمائے ہند کے حالات میں ہے، یہ فصل بڑی حد تک ان کی ایک اور تصنیف تسلیۃ الفؤاد سے ماخوذ ہے[2]، تیسری فصل محسنات کلام (صنائع، بدائع) سے متعلق ہے، چوتھی فصل عاشق و معشوق کی خصوصیات سے متعلق ہے، اس کتاب میں آزاد نے ہندوستان کی موسیقی اور نائکہ بھید پر تفصیل سے لکھا ہے، یہ کتاب ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی، اس کے علاوہ مصر سے بھی

[1] خزانۂ عامرہ ص ۳ [2] آزاد: سبحۃ المرجان ص ۱۲۲ [3] لالہ سری رام: خمخانۂ جاوید (لاہور ۱۹۰۸ء) جلد اول ص ۲۶

شائع ہوئی تھی،[۱]

سبحۃ المرجان کے تیسرے اور چوتھے باب کا ترجمہ خود آزاد نے غزلان الہند کے نام سے ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴-۶۵ء میں فارسی میں کیا تھا۔ اسٹوری کا بیان ہے کہ آزاد نے یہ ترجمہ اپنے دوست (شاگرد) عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی اور لچھمی نرائن شفیق کی فرمائش سے کیا تھا، لیکن خود شفیق اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ عبدالقادر مہربان کی خواہش پر کیا تھا،[۲]

سبحۃ المرجان کے پہلے اور دوسرے باب کا فارسی ترجمہ سید شمس الدین بن شاہ وارث علی حسن الحسینی بنارسی نے بنارس کے راجہ مہاراج ایسری پرشاد کی فرمائش پر کیا تھا، سید شمس الدین مہاراجہ ایسری پرشاد کی ملازمت میں تھے،[۳]

نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کو فن سیرت سے بڑی دلچسپی تھی، سلاطین تیموریہ اور تیموری عہد کے امراء کے حالات ان کے نوک زبان تھے، چنانچہ انھوں نے اس عہد کے امراء کے حالات لکھنے شروع کیے، اور بڑی حد تک اس کام کو مکمل کر لیا تھا، لیکن ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء میں وہ ایک معرکہ میں کام آئے، ان کا گھر لٹ گیا، کتاب خانہ برباد ہوگیا، مسودہ کے اجزاء منتشر ہوگئے،

آزاد نے بڑی جد و جہد کے بعد انھیں ڈھونڈھ نکالا اور ترتیب دینا شروع کیا، بعض مشاہیر کے حالات تلف ہوگئے تھے، انھیں لکھا، بعض امراء کے حالات ناکمل تھے، انھیں کمل کیا، خود مصنف کے حالات لکھے، اس طرح یہ یادگار زمانہ کتاب مآثر الامراء کے نام سے ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں تکمیل کو پہنچی، "زہے ادیب مصاحب مآثر الامراء" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے،[۴] یہ ۱۸۸۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی،

[۱] لالہ سری رام: خمخانۂ جاوید (لاہور ۱۹۰۸ء) جلد اول ص ۲۷ [۲] شفیق: گل رعنا [۳] عبدالمقتدر: فہرست مخطوطات اورنٹیل پبلک لائبریری (پٹنہ ۱۹۳۵ء) جلد ۸ ص ۸۰، [۴] شاہ نواز خاں: مآثر الامرا (کلکتہ ۱۸۸۸ء) جلد ۱ ص ۲، ۱۱۰۳

آزاد کی کئی تصانیف کا ذکر اوپر ان کے حالات میں آچکا ہے، ان کے علاوہ بعض اور تصانیف ہیں جن کا ذکر ان کا زمانۂ تصنیف معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مناسب موقع پر نہ ہوسکا، ان کا تذکرہ بیان کیا جاتا ہے:-

۱- عربی: ضوء الدراری - آزاد کو ادب و تاریخ کے علاوہ حدیث سے بھی دلچسپی تھی، اس لیے صحیح بخاری کا مطالعہ ان کے لیے ناگزیر تھا، اس مطالعہ کا نتیجہ یہ کتاب تھی، جو صحیح بخاری کی کتاب اول سے لیکر کتاب الزکوٰۃ تک کی شرح ہے،[۱] سید مقبول احمد صمدنی لکھتے ہیں کہ یہ شیخ شہاب الدین کی ارشاد الساری کا بزیادت بعض فوائد ملخص ہے۔[۲]

۲- دو دیوان - ان کا ذکر خود آزاد نے سبحۃ المرجان میں کیا ہے، اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ مجھ سے پہلے کسی ہندوستانی کا عربی دیوان مرتب نہیں ہوا اور نہ کسی ہندوستانی نے اس اسلوب کے عربی اشعار کہے، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے یہ دونوں دیوان مدینہ کے بعض فضلا کو بھیجے، انھوں نے ان کو گنبد خضرا کے سامنے رکھا بلکہ مزار اقدس کی جالیوں کے اندر ڈال دیا، مجھے امید ہے کہ میرے ان دواوین کو قبول عام حاصل ہوگا۔[۳] یہ دیوان حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں۔

۳- السبعۃ السیارہ - یہ سات دواوین کا مجموعہ ہے، اس میں ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء سے ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء تک کا کلام ہے،[۴] سید مقبول احمد صمدنی کا بیان ہے کہ اس کا انتخاب "مختار دیوان آزاد" کے نام سے مطبع آسی لکھنؤ سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا،[۵]

۴- تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد - قصائد کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر نعتیہ قصیدے ہیں،

[۱] آزاد: سبحۃ المرجان ص ۱۲۲، [۲] سید مقبول احمد: حیات جلیل، حصہ دوم ص ۱۷۵ (حاشیہ) [۳] آزاد: سبحۃ المرجان ص ۱۲۲، ۱۲۳، [۴] اسٹوری: پرشین لٹریچر، جلد اول حصہ دوم ص ۸۶۱ [۵] سید مقبول احمد حیات جلیل حصہ دوم ص ۱۷۵ (حاشیہ)

اس کا کچھ حصہ آزاد نے تراجم علماء کے عنوان سے سبحۃ المرجان میں شریک کرلیا ہے۔[1]

۵۔ **مظہر البرکات**۔ ایک صوفیانہ مثنوی سات دفتروں میں ہے، پہلا دفتر ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء میں اور دوسرا، تیسرا اور چوتھا ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء میں پورا ہوا، دوسرے دفتروں کے آخر میں تاریخ نہیں ہے۔[2]

۶۔ **شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب متنبی**۔ اس میں متنبی کے کلام کی مخصوص اصطلاحات کی شرح ہے۔[3]

۷۔ **کشکول**۔ کتب خانۂ آصفیہ کے کیٹلاگ میں اسے عربی کتابوں میں رکھا گیا ہے، اور شمس اللہ قادری صاحب قاموس العالم فارسی کتاب بتاتے ہیں۔ اسٹوری کا خیال ہے کہ اس میں دونوں زبانوں کے اشعار کا انتخاب ہوگا۔[4]

۸۔ **مکاتیب حضرت مجدد**: سید مقبول احمد صمدنی کا بیان ہے کہ آزاد نے حضرت شیخ مجدد سرہندی کے مکاتیب میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔[5]

فارسی: ۱۔ **شجرۂ طیبہ**۔ اس کتاب میں آزاد نے ساداتِ بلگرام کے احوال و انساب لکھے ہیں۔[6]

۲۔ **مرآۃ الجمال**۔ اس میں ۱۰۵ اشعار ہیں جن میں معشوق کا سراپا کھینچا گیا ہے۔[7] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ میں (سبحان اللہ سیکشن) ایک مخطوطہ "مثنوی سراپائے معشوق" ہے، اسٹوری کا خیال ہے کہ یہ مثنوی اور مرآۃ الجمال ایک ہی چیز ہے۔[8]

---

[1] آزاد: سبحۃ المرجان ص ۱۲۲ [2] اسٹوری: پرشین لٹریچر جلد اول حصہ دوم ص ۸۶۱ [3] نواب صدیق حسن خان: اتحاف النبلاء المتقین (کانپور ۱۲۸۸ھ) ص ۱۳۳ [4] اسٹوری: پرشین لٹریچر جلد اول حصہ دوم ص ۸۶۲ [5] سید مقبول احمد: حیات جلیل حصہ دوم ص ۱۰۵ [6] ایضاً حصہ اول ص ۶۱ [7] نواب صدیق حسن خان: اتحاف النبلاء ص ۱۳۳ [8] اسٹوری: پرشین لٹریچر، ج اول حصہ ۲ ص ۸۶۲

۳۔ **دیوان فارسی**۔ حیدرآباد میں ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء میں طبع ہو چکا ہے۔

۴۔ **سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات**۔ یہ ۳۲ صفحے کا رسالہ ہے، جس میں آزاد نے سادات کے فضائل و مکارم بتائے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سادات کا خاتمہ لازمی طور پر اچھا ہوتا ہے، یہ رسالہ بمبئی میں ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء میں چھپ چکا ہے۔

۵۔ **مثنوی بجواب مثنوئ میر عبد الجلیل بلگرامی**۔[1] میر عبد الجلیل کی مثنوی فرخ سیر کی کتخدائی (۱۱۲۷ھ / ۱۷۱۵ء) سے متعلق ہے۔

۶۔ **چند منظومات اور رسائل**۔[2] ان رسائل کا ذکر خود آزاد نے سبحۃ المرجان میں (ص ۱۲۳) کیا ہے، منظومات میں بہت ممکن ہے کہ مثنوی بجواب مثنوئ میر عبد الجلیل بلگرامی بھی شامل ہو۔

(اُردو) ۱۔ **دیوان اردو**۔ آزاد کی کسی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے اردو میں بھی اشعار کہے تھے، تذکرہ نگار بھی بالعموم اس بارہ میں خاموش ہیں، سید مقبول احمد صمدنی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "اردو میں شعر کہنا آزاد اپنے مرتبۂ عالی سے پست و دوں سمجھتے تھے"[3] لیکن اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ میں ان کے اردو دیوان کا ذکر کیا ہے اور ان کے دو شعر بھی نمونہ کے طور پر نقل کیے ہیں۔[4] چونکہ تمنا آزاد کے شاگرد تھے، اس لیے ان کے بیان پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

۲۔ **گربہ نامہ**۔ سید مقبول احمد صمدنی لکھتے ہیں کہ "بازاروں میں ایک چند ورقہ رسالہ گربہ نام کا ملتا ہے، اس میں (آزاد نے) چوہے بلی کا قصہ عوام یا نوعمروں کی تفریح خاطر

---

[1] اسٹوری: پرشین لٹریچر ج ا حصہ ۲ ص ۸۶۲ [2] سید مقبول احمد: حیات جلیل حصہ ۲ ص ۱۷۶ [3] ایضاً ص ۱۷۵ [4] اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی: گل عجائب (اورنگ آباد ۱۹۳۳ء) ص ۳

کے لیے اردو میں نظم بند کر دیا ہے[۱]، لیکن سید وجاہت حسین کا خیال ہے کہ یہ نظم پند و نصیحت کا کام کرتی ہے، یہ لوگوں کو ریاکاروں سے جو فطرۃً برے ہیں، بچنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ان کی رائے میں پچھلے ڈیڑھ سو برس میں اردو زبان نے جو ادب پارے پیدا کیے ہیں ان میں سے ایک یہ نظم بھی ہے، وہ اس کا نام بلی نامہ بتاتے ہیں[۲]۔

آزاد کی زندگی کے تقریباً ۴۰ سال دکن میں گزرے، اس طویل مدت میں بیسیوں حادثات پیش آئے، مثلاً ان کے والدین اللہ کو پیارے ہوئے، ان کے ماموں اور استاد سید محمد نے وفات پائی، نوجوان اکلوتا بیٹا ڈوب کر مر گیا۔ خالہ زاد بھائی اور خواجہ تاش سید محمد یوسف کا انتقال ہوا، اور بھی بہت سے عزیز دنیا سے اٹھ گئے، لیکن دکن کی مٹی نے ان کا کچھ ایسا دامن پکڑا کہ یہ وہاں سے نہ ٹل سکے، اپنے بھتیجے میر اولاد محمد ذکا[۳] اور اپنے پوتے امیر حیدر[۴] کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد بلگرام واپس بھیج دیا[۵]۔

شاہ نواز خاں نے آزاد کے نام وقتاً فوقتاً خطوط لکھے تھے۔ ان میں سے دو خط اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ (آخر عمر میں) آزاد مختلف عوارض کا شکار رہا کرتے تھے۔ ایک خط کے ذریعہ شاہ نواز خاں انھیں تسلی دیتے ہیں کہ

"حدوث تپ قولنج و رفع آن و بقیۂ نقاہت و پرہیز از نوشتۂ ایشان معلوم شد
دنیا محل مکارہ است، عاقبت بخیر باد[۶]"

---

[۱] سید مقبول احمد: حیات جلیل حصہ دوم ص ۱۰۷، [۲] سید وجاہت حسین: جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ ۱۹۳۶ء) ص ۱۳۰، [۳] ان کے حالات کے لیے دیکھیے گل عجائب ص ۵۲ تا ۵۶ سفینۂ ہندی ص ۸۰ وغیرہ [۴] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو محبوب الزمن ج ۱ ص ۲۱۸، ۲۱۹ [۵] سید مقبول احمد: حیات جلیل حصہ ۲ ص ۱۶۸ [۶] شاہ نواز خاں: منشآت شاہنواز خاں (قلمی) بمبئی یونیورسٹی لائبریری۔

دوسرے مکتوب میں وہ آزاد کی گوناگوں شکایتوں اور عوارض پر اپنے غم و ملال کا اظہار کرتے ہیں:

"از نوشتہ رائے سدھاری لال معلوم شد کہ از ہیجان خون و بلغم مزاج دشمنان مہربان کسل دارد و اگرچہ خون کم شدہ تقاضا و خلش قولنج و قلق و اضطرار از ہمان قسم است باستماع این معنی موجب تردد و تفکر شد، حکیم علی الاطلاق از فضل خود زود شفای کامل عطا فرماید[۱]۔"

صاحب محبوب الزمن تنبیہ الشاکین فی جلائل حضرت محبوب سبحانی[۲] مؤلفہ غلام علی راشد[۳] کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

"آپ (آزاد) نے ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء میں عزم جزم کیا کہ اس مسافر خانۂ ناپائدار سے دار السرور ناپائدار کی طرف رحلت ضرور ہے، پس زاد و راحلہ کی فکر کرنا چاہیے، رات دن اعمال خیر و افعال پسندیدہ کیے جاتے تھے، اور مکان اصلی و وطن ابدی کی طرف جانے کے لیے مستعد رہتے تھے، آپ نے جسم خاکی کے دفن کے لیے ایک قطعۂ زمین روضۂ خلد آباد میں قریب مزار حضرت شاہ برہان الدین غریب خرید کیا اور وہاں قبر بنوائی، تاکہ اس قالب سے روح کے برآمد ہونے کے بعد آسانی سے جسم فانی کو اس میں دفن کریں اور آپ نے اس کا نام عاقبت خانہ رکھا۔ عاقبت خانہ کی آبادی و تعمیر کا جشن بزرگ و عرس عظیم الشان منعقد فرمایا، جس میں شعراء و امراء و مشائخ کو دعوت دی، عمدہ عمدہ کھانے پکوائے اور طرح طرح کے حلوے بنوائے، حاضرین دعوت کی خاطر و مدارات و تواضع میں ایک دقیقہ فرو گذاشت نہیں فرماتے تھے، اور کہتے تھے یہ جشن وداعی ہے"

---

[۱] منشآت شاہ نواز خاں (قلمی) بمبئی یونیورسٹی [۲] صاحب محبوب الزمن لکھتے ہیں کہ یہ کتاب رود موسیٰ کی طغیانی میں تلف ہو گئی (محبوب الزمن ج ۱ ص ۲۸۶) [۳] ان کے حالات چمنستان شعراء (شفیق) گل عجائب (تمنا) وغیرہ میں ملتے ہیں، لیکن بہت مختصر۔

غنیمت ہے خلان با صفا و دوستان باوفا کا مجمع، آپ ہر ایک سے فرماتے تھے، بذاذاق جینی و بینک۔ آپ کے اس فقرہ سے ہر ایک کے دل پر حسرت و رقت موثر ہوتی تھی، آپ ہشاش و بشاش تھے، فرماتے تھے، یہ جدائی چند روزہ ہے، آخر ہم سب عقبیٰ میں باہم ملیں گے، یکے بعد دیگرے، اسی مقام اصلی میں پہنچ جائیں گے، فرق اتنا ہے کہ کوئی آگے کوئی پیچھے پہنچے گا، طعام سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے تمام حاضرین جشن کا شکریہ ادا کیا اور ہر ایک سے معافی چاہی، شعرائے آپ کے عاقبت خانہ کی تعمیر کی تاریخیں کہیں اور آپ کی مدح سرائی میں قطعات مدحیہ و دعائیہ لکھے۔[1]"

اس جشن کے بعد آزاد پانچ سال اور زندہ رہے، انھوں نے ۸۹ سال کی عمر میں ۲۴ رذیقعدہ ۱۲۰۰ھ (۱۵ ستمبر ۱۷۸۵ء) کو وفات پائی اور اپنی وصیت اور خواہش کے مطابق روضۂ شریفہ خلد آباد میں جو اورنگ آباد سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، ابدی نیند سو رہے ہیں، لوح مزار پر مندرجۂ ذیل کتبہ ہے،

هوالحی القیوم

حسان الہند میر غلام علی آزاد

حسینی واسطی بلگرامی

ولادت: ۲۵ ر صفرالمظفر ۱۱۱۶ھ

آہ غلام علی آزاد

وفات: - ۲۴ ر ذیقعدہ الحرام ۱۲۰۰ھ

!: بیگ کا بیان ہے کہ والدین اپنے بچوں کو ان کے مزار پر اس غرض سے لے جاتے ہیں کہ وہ

۱؎ عبدالجبار خاں ملکاپوری، محبوب الزمن جلد اول ص ۲۸۵، ۲۸۶

ان کی قبر پر سے شکر کی ایک ڈلی اپنے منہ سے اٹھا کر کھالیں تاکہ انھیں علم اور علم کے حاصل کرنے کی صلاحیت نصیب ہو۔[1]

صاحب نشترِ عشق نے آزاد کا سال وفات ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء لکھا ہے، اور ان کے ایک ہم وطن غلام رسول بلگرامی کا مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ وفات بھی دیا ہے:

شاعری نکتہ سنج معنی یاب	یعنی آزاد بی عدیل و مثال
سال تاریخ ہم صفیرش گفت	بلبل ہند طوطی خوش مقال[2]

شیر علی افسوس نے آرائش محفل میں اور نیول نے یو۔ پی کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر (ہردوئی) میں ان کا سال وفات ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷ء دیا ہے، یہ دونوں تاریخیں صحیح نہیں، بحر زخار، تذکرۂ علمائے ہند، محبوب الزمن، بایوگرافکل ڈکشنری وغیرہ میں ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء سال وفات دیا ہے، اس کے علاوہ متعدد تاریخیں جو ان کی وفات پر کہی گئی ہیں، وہ بھی اسی تاریخ کی تائید کرتی ہیں، مثلاً مندرجۂ ذیل دو تاریخیں:-

(۱) امام اہلِ سخن فخرِ اتقیا آزاد	کہ بود سید والا نژاد و نیک نہاد
چو رخت سفر بست ز دنیا بہ عالم عقبیٰ	"بیا بروضۂ قدسی" فلک ندا در داد ۱۲۰۰ھ

(۲) آہ غلام علی آزاد، ۱۲۰۰ھ

۱؎ ٹی، ڈبلیو ہیگ: ہزٹارک لینڈ مارکز آف دی ڈکن (Historic Land marks of The Deccon) (الہ آباد ۱۹۰۷ء) ص ۸۵ ۲؎ حسین قلی خاں: نشترِ عشق جلد اول (قلمی) اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ

شیخ احمد سرہندیؒ
(مجدد الف ثانی)

از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ

(۹)

اولاد و امجاد شیخ مجددؒ کے سات صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں، جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) خواجہ محمد صادقؒ (متوفی ۱۰۲۵ھ)، (۲) خواجہ محمد سعیدؒ (متوفی ۱۰۷۰ھ) (۳) خواجہ محمد معصومؒ (متوفی ۱۰۷۹ھ) (۴) خواجہ محمد فرخ (متوفی ۱۰۲۵ھ) (۵) خواجہ محمد عیسیٰ (متوفی ۱۰۲۵ھ) (۶) خواجہ محمد اشرف (۷) خواجہ محمد یحییٰ (متوفی ۱۰۹۶ھ) (۱) بی بی رقیہ بانو (۲) بی بی خدیجہ بانو (۳) بی بی ام کلثوم۔

خواجہ محمد باقی باللہؒ (م۔ ۱۰۱۲ھ) کی حیات ہی میں شیخ مجددؒ کے ہاں تین صاحبزادے ہو چکے تھے، خواجہ محمد صادق (ولادت ۱۰۰۰ھ) خواجہ محمد سعیدؒ (ولادت ۱۰۰۵ھ) اور خواجہ محمد معصومؒ (ولادت ۱۰۰۷ھ)، خواجہ موصوف نے اپنے ایک مکتوب میں ان صاحبزادگان کے متعلق تحریر فرمایا ہے:۔

"فرزندان آں شیخ (احمد سرہندیؒ) کہ اطفال اند اسرار الٰہی اند بالجملہ شجرِ طیبہ اند انبتہ اللہ نباتاً حسناً"[۱]

خواجہ محمد صادقؒ (متوفی ۱۰۲۵ھ) کے متعلق خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"چوں حضرت ایشان در عدد دو سہ ہزار و ہشت (۱۰۰۸ھ) بصحبت گرامی حضرت ع خواجہ فانی زخود باقی بحق، قدس اللہ تعالیٰ سرہ رسیدند مخدوم زادہ نیز بنظر قبول حضرت خواجہ و اخذ ذکر و مراقبہ و جذبہ و نسبت شریفہ مشرف گشتند و از علوم استعداد و نظرت و برکات نظر رحمت و تربیت حضرت ایشاں احوالات شگرف و معاملات عظیمہ نصیب روزگار ایشاں گردید"[۱]

شیخ مجددؒ نے اپنے مکاتیب گرامی میں صاحبزادۂ موصوف کی جابجا تعریف فرمائی ہے،

"فرزندی اعزی مجموعۂ معارف نقیر است و نسخہ مقامات جذب و سلوک"[۲]

"فرزندی کہ از محرمان اسرار است و از خطا و غلط مصئون"[۳]

"این مقام را بفرزندی ارشدی عنایت فرمودہ اند داخل ولایت ایشاں ساختہ نقیر ایں جا در رنگ مسافراں در ولایت ایشاں نشستہ است"[۴]

"استفادہ کہ ایں نقیر از ولایت موسوی نمودہ از راہ اجمال آں ولایت است و استفادہ فرزندی اعظمی علیہ الرحمہ از راہ تفصیل آں ولایت، ولایت ایں فقیر کہ از ولایت موسوی مستفاد ست شبیہ ولایت رجل مومن ست کہ از آل فرعون بودہ و ولایت فرزندی علیہ الرحمہ شبیہ ولایت سحرہ فرعون کہ ایمان آوردند"[۵]

خواجہ محمد صادقؒ، خواجہ محمد فرخؒ، اور خواجہ محمد عیسیٰؒ کا انتقال ۱۰۲۵ھ میں ہوا، شیخ مجددؒ نے اپنے ایک مکتوب میں ان تینوں صاحبزادگان کے سانحۂ ارتحال کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ان کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[۱] زبدۃ المقامات ص ۱۴۵

---

[۱] زبدۃ المقامات ص ۱۰۳ [۲] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی، مکتوب نمبر ۲۲۷ دفتر اول [۳] ایضاً [۴] ایضاً مکتوب نمبر ۲۲۳ [۵] ایضاً مکتوب نمبر ۳۱۱

"فرزند اعظمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ باد و برادر خود محمد فرخ و محمد عیسیٰ سفر آخرت اختیار نمودند۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حمد اللہ سبحانہ کہ اولاً باقی ماندگان را قوتِ صبر عطا فرمودند ثانیاً بلیہ را سرو دادند۔ خوش گفت:"

مرا از تو روئے نہ پیچم گرم بیازاری
کہ خوش بود ز عزیزاں تحمل خواری

فرزند مرحومی آیتے بود از آیات حق جل و علا، و رحمتے بود از رحمتہائے رب العالمین در سن بست و چہار سالگی آں یافت کہ کم کسے یافت، پایۂ مولویت و تدریس علوم نقلیہ و عقلیہ را بحد کمال رسانیدہ بود، حتیٰ کہ تلامیذ ایشاں بیضاوی و شرح مواقف و امثال ایں ہا را بقدرت تام درس دادند، حکایات معرفت و عرفان و تفصیل شہود و کشوف ایشاں مستغنی است از آں کہ در بیان آرد۔"[1]

اسی مکتوب میں خواجہ محمد فرخ کے متعلق فرماتے ہیں:-

"از محمد فرخ چہ نویسد کہ در یازدہ سالگی طالب علم شدہ بود کافیہ خواں و شبو سبق می خواند و ہموارہ از عذاب آخرت ترساں و لرزاں بود، دعا می کرد کہ در سن طفولیت دنیائے دنیہ را وداع نماید تا از عذاب آخرت خلاص شود، و در مرض موت یارانے کہ بیمارداری او می کردند عجائب و غرائب از وے مشاہدہ نمودہ اند۔"[2]

خواجہ محمد عیسیٰ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"کرامات و خوارق کہ از محمد عیسیٰ تا ہشت سالگی مردم معائنہ کردہ اند چہ نویسد،

[1،2] زبدۃ المقامات ص ۵-۳۰۴

بالجملہ جواہر نفیسہ بودند کہ بودیعت سپردہ بودند اللہ سبحانہ الحمد و المنۃ کہ امانات را باہل آں بے کرہ و بے اکراہ حوالہ نمودیم۔"[1]

خواجہ محمد سعید (متوفی ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء) کے متعلق خواجہ محمد ہاشم کشمی تحریر فرماتے ہیں:-

"حضرت ایشاں قدس سرہ (مجدد الف ثانی) می فرمودند کہ محمد سعید چہار و پنج سالہ بود کہ وے را رنجورے پیش آمد در غلبات آں ضعف از وے پرسیدہ شد کہ "چہ می خواہی"؟ بے اختیار گفت "حضرت خواجہ را می خواہم"۔ من ایں حروف را بحضرت خواجہ خود قدس سرہ عرض کردم۔ فرمودند کہ "محمد سعید شما زندی و حرم نمود و غائبانہ از ما نسبت در ربود۔"[2]

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے خواجہ محمد سعید کے حالاتِ زندگی مختصراً اس طرح بیان کیے ہیں:-

"ایں مخدوم زادہ بعد از رسیدن بہ سن تمیز بتحصیل علوم صوری پرداختہ حصہ (گ) از علوم را در خدمت حضرت ایشاں رضی اللہ عنہ و برخے را در ملازمت برادر بزرگ خود قدس سرہ و بعضے را در صحبت شیخ طاہر لاہوری سلمہ اللہ باخر رسانیدند تا در انواع علوم عقلی و نقلی مہارت تمام حاصل کردند و از حفظ تصرف و یمن توجہ والد بزرگوار در عین ایں تحصیل از نسبت ایں طائفۂ بزرگ احوالات بلند بدست آوردند و ایں مجموع کمالات صوری و ترقیات معنوی با تمام و انجام رسانیدند در سن ہفدہ و ہژدہ سالگی بار دیدہ شد گویا در ایشاں بلوغ طبع ببلاغت معنوی توام گردید از آں وقت تا حال کتب علوم دقیقہ را از معقول منقول بمہارت تمام درس می فرمایند در بعض کتب معتبرہ تعلیقات و حواشی زیبا رقم فرمودہ اند۔"[3]

[1] زبدۃ المقامات ص ۳۰۵ [2] ایضاً ۳۰۹ [3] ایضاً ص ۳۰۹

خواجہ محمد معصومؒ (متوفی ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء) ۱۲ر شوال المکرم ۱۰۰۷ھ میں تولد ہوئے، شیخ مجددؒ نے خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ سے موصوف کے متعلق فرمایا تھا:-

"قدوم میمنت لزوم محمد معصوم یعنی ولادت او مارا بس مبارک و ہمایوں آمد کہ بعد از تولد او بچند ماہ بملازمت حضرت خواجہ خود مشرف شدیم۔ و دیدیم آنچہ دیدیم۔"[1]

شیخ مجددؒ نے مکاتیب شریفہ میں جابجا صاحبزادۂ موصوف کی تعریف فرمائی ہے، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"..... از فرزندی محمد معصوم چہ نویسد کہ دے بالذات قابل ایں دولت ست یعنی ولایت خاصہ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ۔"[2]

ایک اور مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:

"..... خاطر ہمیشہ متوجہ احوال شماست و خواہان کمال شما دیروز بعد از نماز بامداد مجلس سکوت داشتم ظاہر شد خلعتے کہ داشتم از من جدا شد و خلعت دیگر من متوجہ شد کہ بجائے آں خلعت نشیند بخاطر آمد کہ ایں خلعت زائلہ را کسے خواہند داد و بانہ دارزدے آں شد کہ آں را بفرزند ارجمند محمد معصوم بدہند۔ بعد از لمحہ دید کہ بفرزندی مرحمت فرمودند و آں خلعت او، را تمام پوشانید و آں خلعت زائلہ کنایہ از معاملہ قیومیت بودہ است کہ بتربیت و تکمیل تعلق داشتہ و باعث ارتباط بایں حوصلہ مجمر او بودہ وایں خلعت جدیدہ را چوں معاملہ بانجام رسید و مستحق خلع کردہ امید دارست کہ از کمال کرم آں را بفرزندی اعزی محمد سعید عطا فرمایند ایں فقیر بتضرع مسالت ایں معنی می نماید و اثر اجابت می فہمد و فرزندی را مستحق ایں دولت می یابد۔"[3]

۱؎ زبدۃ المقامات ص ۱۶-۲۱۵ ۲؎ ایضاً ص ۲۱۶ ۳؎ ایضاً ص ۱۷-۲۱۶

حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے اورنگ زیبؒ عقیدت و محبت رکھتے تھے، چنانچہ خواجہ موصوف کئی بار دربار شاہی میں تشریف لے گئے۔ صاحب فرحت الناظرین لکھتے ہیں:-

"بنابر اشتہائے بادشاہ دین پناہ چند بار بہ بارگاہ عظمت وجاہ رسیدہ بہ اقسام بتجلیل و تکریم و انواع توقیر و تعظیم مخصوص گشتہ بود۔"[1]

عالمگیر نامہ میں دونوں صاحبزادگان کے متعلق تحریر ہے:

"و شیخ محمد سعید و شیخ محمد معصوم پسران شیخ منفور واقف اسرار حقایق و علوم شیخ احمد سرہندی کہ ہر یک در فضائل و کمالات صوری و معنوی خلف الصدق آں سالک مسالک طریقت و عرفان ست۔ بہ انعام سہ ہزار اشرفی مورد نوازش گردیدند۔"[2]

خواجہ محمد معصومؒ (م ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء) کے صاحبزادے خواجہ سیف الدینؒ (م ۱۰۹۶ھ) کے متعلق صاحب عمدۃ المقامات تحریر فرماتے ہیں:-

"از خدمت والد خود برائے تربیت سلطان وقت در دار السلطنت می بودند امراء و سلاطین زماں ہمہ در فرمان ایشاں بودند۔"[3]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"در جوع خلائق آں قدر شدہ بود کہ روزے بادشاہزادہ محمد اعظم شاہ بخدمت ایشاں برائے توجہ می آمد و آں قدر جمہور خلائق بر دروازۂ ایشاں بود کہ از ہجوم دستار از سر بادشاہزادہ افتادہ و بمشقت تمام دخول میسر شد، و بخدمت ایشاں رسیدہ توجہ شریف حاصل نمود، چوں بخدمت سلطان رسید و احوال ہجوم خلق بہ عرض رسانید والدش ازیں سخن بسیار محظوظ شد کہ الحمد للہ کہ دریں نوع

۱؎ شیخ محمد اکرام: رود کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۲۰۸ ۲؎ ایضاً ص ۲۰۸ ۳؎ شاہ محمد فضل اللہ عمدۃ المقامات مطبوعہ لاہور ۱۳۵۵ھ ص ۳۶۲

مردم اہل اللہ دریں زمانہ کہ سلاطین رابدر آں بایدیں مشقت راہ حاصل می شود"[1]

خواجہ محمد معصومؒ کے پانچویں فرزند شیخ محمد صدیقؒ کے متعلق صاحب عمدۃ المقامات رقمطراز ہیں :-

"روز آخر عمر شریف در دار السلطنت دہلی تشریف فرماشدہ بودند و محمد فرخ سیر کہ بادشاہ وقت بود مرید ایشان بود وصال ایشان پنجم شہر جمادی الاول سنہ ہزار و صد و سی و یکم ہجری در دار السلطنت مذبور روداد۔ از آں جا تابوت شریف ایشان را بدر الارشاد آوردند"[2]

شیخ مجددؒ کے چھٹے صاحبزادے خواجہ محمد اشرف بقول صاحب جواہر مجددیہ، صغر سنی میں وفات پاگئے، شیخ مجددؒ کا جب وصال ہوا تو ساتویں صاحبزادے خواجہ محمد یحییٰ دس برس کے تھے، ان کی ولادت ۱۰۲۴ھ میں ہوئی تھی۔ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ موصوف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"بعد از انتقال حضرت ایشان وپس از تمامی حفظ قرآن بہمین تربیت برادران بزرگوار تحصیل علوم چہ معقول و چہ منقول بآخر رسانیدند و باستحکام تمام واستحضار کامل بدرس کتب متداول و نشر علوم بر منصہ افادہ و اضافہ اقامت دارند و بطریقہ انقطاع و تبتل و آزادی و بے تعینی و ضبط اوقات و حفظ اوضاع و ملازمت سنۃ سنیہ و رعایت ایں طریقہ علیہ بوجہ اوفر مستقیم، و مستدیم اند چناں کہ آثار نجابت و وراثت نسبت معنویہ بر جبین مبین شان شاہد عدل است و علیہ ایشان از قامت در فتار و چشم و ابرو بوالد بزرگوار خویش شباہت تمام دارد و از دلائل قبول آں مخدوم زادہ آن ست کہ نبیرۂ حضرت خواجہ باقی باللہ

---

[1] شاہ محمد فضل اللہ: عمدۃ المقامات، مطبوعہ لاہور ۱۳۵۵ھ ص ۳۹۳، ۳۹۴
[2] ایضاً ص ۳۹۵

دختر خواجہ کلاں خواجہ عبید اللہ سلمہ اللہ وابقاہ در حبالۂ نکاح آں گوہر صدف ولایت منسلک گردیدہ است و باوجود نسبت معنوی بہ نسبت صوری نیز شرف امتیاز یافتہ"[1]

اورنگ زیب علیہ الرحمہ نے بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفاضہ کیا تھا، شاہ محمد رؤفؒ تحریر فرماتے ہیں :-

"اورنگ زیب بادشاہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی توجہ حاصل کی اور بہت سی ملکیت آپ کی نذر کی، چنانچہ یہ ضرب المثل ہو گیا تھا" الملک للہ والملک یحییٰ"[2]

خواجہ محمد یحییٰؒ کی تصنیف تاریخ مبارک شاہی بڑی اہمیت رکھتی ہے، پیٹر ہارڈی (P. Hardy) اس کے متعلق لکھتا ہے :-

"The value which mordern his To rians of medieval India has attached to this history has been a scarcity value"[3]

اور بقول ڈوسن (Dowson) نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں، ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اور محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی نے تاریخ فرشتہ میں تاریخ مبارک شاہی سے کافی مدد لی ہے۔

المختصر شیخ مجددؒ کے صاحبزادگان آسمان علم کے درخشاں ستارے اور گلشن معرفت کے مہکتے پھول تھے، خواجہ محمد باقی باللہؒ (م۔ ۱۰۱۲ھ) نے صحیح فرمایا تھا:

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۳۲۶ [2] شاہ محمد رؤف: جواہر علویہ، مطبوعہ لاہور ص ۱۰۳
[3] P. Hardy: Historians of Medieval India. Ldon 1960 P. 56

"اسرار الٰہی اند۔ استعدادہائے عجب دارند بالجملہ شجرۂ طیبہ اند

انبتہ اللہ نباتاً حسناً۔ (زبدۃ المقامات ص ۳۰۹)

تصانیف شیخ مجددؒ حضرت مجددؒ کی تالیفات و تصنیفات، آپ کی تبحر علمی پر شاہد عدل ہیں، خود آپ کے معاصرین علماء و فضلاء نے سراہا ہے، چنانچہ ایک مشہور عالم نے خواجہ محمد ہاشم کشمی سے کہا تھا:

"کتب و رسائل توام، تصنیف است یا تالیف۔ تالیف آنست کہ سخنان مردم را بسیاق و سیاق نیکو جمع آوری و تصنیف آں کہ علوم و نکات رو دادۂ خود را بنگاری، خواہ آں نکات از مہارت علمی و علو فطرت بظہور رسیدہ باشد، خواہ بالہام ربانی و مکشوف صادق جلوہ گر گردیدہ، مدتہا بود کہ از میان اہل روزگار تصنیف رفتہ و ہمیں تالیف ماندہ بود الا نادرت کہ بعضے مولفان در توالیف خویش از زادہ علم بازدق خود حرفے می آرند اکنوں انصاف این است کہ دریں خیر زماں تصنیف متین زیبا رسائل و مکاتیب شیخ بزرگوار تست کہ ہر چند بداں عبور نمودیم از دیگراں آں جا نقل ندیدیم الا نادرت و ضرورت، بیشترش کشوفات و ملہمات خاصہ ایں بزرگ دین است و ہمہ عالی و نازنین در فن شرع متین [1]"

جزاہ اللہ عن الطالبین خیر الجزاء۔"

ان تصانیف میں مکاتیب خاص امتیازی شان رکھتے ہیں، یہ تین مجلدات میں ہیں اور شیخ مجددؒ کی اصلاحی مساعی اور تبلیغ و ارشاد کے آئینہ دار ہیں، ان کے مطالعہ سے

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۶ - ۲۱۵

روح کو تازگی اور دل کو زندگی ملتی ہے، اور تعمیر سیرت کے لیے ان مکاتیب کا مطالعہ کافی و وافی ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے شیخ مجددؒ کی مؤلفات و مصنفات پر یہ حقیقت افزا تبصرہ کیا ہے:-

"ایں معارف ست کہ دفاتر مکتوبات کثیر البرکات و رسائل معادن الفتوحات متضمن آن ست و ہر معرفتے از آں شفابخش دلہائے رنجوراں، و مقرب دوراں و مہجوراں بنقل آنہا نقل ہر محفل آوازۂ شان آویزۂ گوش ہر دل، ہر فقرہ از آں خاتم اسرار فقر را نگینہ، و ہر فصلے از آں جواہر اسرار وصل را خزینہ، اقلام از مباشرت آں ارقام نیستان شکر از تضمین آں کلمات بوستان ازہر، کامہا از شیرینی آں مقال بہ حلاوت ایماں ہمدوش، و دلہا از صفائے آں اسرار با انوار لایزال ہم آغوش۔ جامع اسرار دین و انوار یقین۔ مظہر راز مخفیہ، کتاب مبین، مرآت جمال معانی احادیث سید المرسلین، حلال مشکلات کلامیہ و فقہیہ حاوی دقائق و معارف تشبیہ و تنزیہ، ترجمان غوامض کلمات متقدمین کبر دستور احوال و اقوال متاخرین علما و عرفا قدس اللہ سرہ [2]"

تصانیف شیخ مجددؒ ۱- الرسالہ فی اثبات النبوہ [3] (عربی) (۲) تعلیقات العوارف [4] (۳) الحاشیہ علی شرح العقائد الجلالی [5]، (۴) المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ [6] (معربہ شاہ ولی اللہ دہلوی) (۵) "در المعرفت" جلد اول مکتوبات شریفہ۔ مرتبہ مولانا یار محمد الجدید البدخشی الطالقانیؒ۔ تعداد مکتوبات ۳۱۳، سنہ تالیف ۱۰۲۵ھ۔

[2] زبدۃ المقامات ص ۴-۲۲۳ [3-6] Dr. Zubaid Ahmed:- Contribution of India to Arabic Literature Allahabad, 1945. PP. 98 and 325

(۶) "نور الخلائق" جلد دوم مکتوبات شریف - مرتبہ مولانا عبد الحئی حصاریؒ، تعداد مکتوبات ۹۹ سنہ تالیف ۱۰۲۸ھ (۷) "معرفۃ الحقائق" جلد سوم مکتوبات شریف۔ مرتبہ مولانا محمد ہاشم کشمیؒ برہانپوری، تعداد مکتوبات ۱۲۲، سنہ تالیف ۱۰۳۱ھ (۸) مبداء و معاد۔ (۹) مکاشفات غیبیہ (۱۰) معارف لدنیہ (۱۱) رد الرفضہ۔ (۱۲) شرح رباعیات خواجہ بیرنگ (۱۳) رسالہ تہلیلیہ ولاتعین (۱۴) رسالہ مقصود الصالحین (۱۵) رسالہ دربیان مسئلۂ وحدت الوجود (۱۶) آداب المریدین (۱۷) رسالہ جذب و سلوک، (۱۸) رسالہ علم حدیث[1] (۱۹) رسالہ حالات خواجگان نقشبندیہ[2] (۲۰) مجموعۂ تصوف[2] (۲۱) رسالہ تہلیلیہ۔

---

[1] خواجہ محمد حسین خاں: جواہر مجددیہ۔ مطبوعہ لاہور، ص ۵

[2] Charles Rieu: Catalogue of The Persian Manuscripts in The British Museum, Vol III P. 1058, London 1883

بزم صوفیہ

یعنی عہد تیموری سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، بو علی قلندر پانی پتیؒ، شیخ فرید الدین عراقیؒ، خواجہ گیسو درازؒ وغیرہ کے مستند حالات و تعلیمات۔

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے۔

ضخامت ۵۳۰ صفحے۔ قیمت :- ۔/۳ روپے

منیجر

بیاض باسطی

از جناب ڈاکٹر ظ انصاری ایوبی ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نواب بندہ علی شیر افگن خاں باسطی کو شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا، یہ لگاؤ اساتذۂ سلف و خلف کے دواوین کے مطالعہ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ وہ خود بھی اچھی خاصی شاعری کرنے لگے تھے، چنانچہ ان کا ذکر سفینۂ ہندی، صبح گلشن، نشتر عشق، گل رعنا، عقد ثریا وغیرہ میں بھی ہے، لیکن چونکہ انھوں نے خود اپنا مجموعۂ کلام اپنے استاد شیخ علی حزیں کے مشورے کے مطابق تلف کر دیا تھا، اس لیے انکا دیوان عنقا ہے، لیکن ان کے پسندیدہ اشعار کی ایک بیاض کا ذکر البتہ تذکرہ نگاروں نے کیا ہے جس میں بہت سے شعراء کے کلام کے انتخاب کے ساتھ ہی ساتھ باسطی نے خود اپنی مثنوی، قصیدہ اور رباعیاں بھی شامل کی تھیں، اس وجہ سے یہ بیاض بہت اہم ہے، لیکن اس کے نسخے بہت ہی کمیاب ہیں، سب سے پہلے پروفیسر سید حسن نے اس کی جانب توجہ کی اور اس بیاض کا ایک مخطوطہ بھی تلاش کر لیا جو کتب خانۂ خدا بخش بانکی پور میں محفوظ ہے، موصوف نے اس نسخے اور اس کے مؤلف پر ایک فاضلانہ مضمون بھی تحریر کیا جو آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اجلاس دوم (۲۷، ۲۸، دسمبر ۱۹۵۹ء) منعقدہ علی گڑھ میں پڑھا گیا اور مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں شائع ہوا، اس مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے اس بیاض کے دو اور نسخوں کی بھی اطلاع دی ہے جن کا ان کو علم ہو سکا ہے، اس طرح ان کو صرف تین نسخوں کا علم تھا، اتفاق سے اس بیاض کا ایک اور نسخہ مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی

مولانا آزاد لائبریری میں ملا ہے[1] جو غالباً دوسرے نسخوں سے زیادہ قدیم ہے۔

اس نسخہ کی تقطیع ۱۴×۲۱ سنٹی میٹر اور کتابت کی ناپ ۹ × ۱۴ سنٹی میٹر ہے۔ اس کی کتابت بہت خوش خط ہے لیکن چند صفحوں کے حواشی کا کاغذ گل جانے کی وجہ سے الفاظ مفقود ہو گئے ہیں، مخطوطہ کے خاتمہ کی عبارت سے جو نثر میں ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کاتب محمد باقر ولد حسن عسکری ہیں، لیکن سنہ کتابت اور مقام کتابت درج نہیں ہے۔ اس نسخے اور پروفیسر سید حسن کے بیان کردہ نسخوں میں محتویات کے لحاظ سے شاید زیادہ فرق نہ ہو، لیکن میری نظروں میں اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ اس کا نام یونیورسٹی کی مخطوطات کی قلمی فہرست میں "تذکرۂ شاعراں" یا "تذکرۂ شعراء" کے بجائے "بیاض اشعار منتخب" تحریر ہے۔ اصل مخطوطہ پر نام نہ دارد ہے اور سرورق پر میر غلام علی آزاد بلگرامی کی ایک تحریر اور مہر ثبت ہے۔ جو درج ذیل ہے:

"این بیاض تحفہ کہ تالیف نواب شیر افگن خاں باسطی است، نواب موصوف
آں را ہمراہ میر شمس الدین متخلص بفقیر عباسی دہلوی بر سبیل ہدیہ بفقیر آزاد بلگرامی
فرستادند سلمہ اللہ تعالیٰ۔ راقمہ فقیر آزاد بلگرامی عفی اللہ تعالیٰ عنہ

فقیر آزاد
۱۱۶۸ھ

اس عبارت سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ باسطی نے خود آزاد بلگرامی کو بطور تحفہ اپنے استاد میر شمس الدین فقیر کے ہاتھ بھیجا تھا اور آزاد بلگرامی نے بھی اس کو "بیاض" ہی کہا ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۶۸ھ میں مکمل ہو چکی تھی، نہ کہ ۱۱۷۰ھ میں جیسا کہ پروفیسر سید حسن کا خیال ہے۔[2]

---

[1] نشن نمبر ت (۱)، ۱۲۷ [2] دیکھئے مجلۂ علوم اسلامیہ جلد ۱ نمبر ۲ ص ۴۷

میر غلام علی آزاد بلگرامی کی اس اہم تحریر کے علاوہ سرورق اور خاتمہ پر اور بھی یادداشتیں موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آزاد بلگرامی کے انتقال کے ۹۴ سال بعد ۹ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ کو یہ بیاض آزاد کے کتبخانے سے سید مصطفیٰ حسین زیدی واسطی قنوجی کے پاس گئی اور اسکے دو سال بعد محمد حسین نے مندرجۂ ذیل یادداشت سرورق پر درج کی:-

"تا حال کہ تاریخ وصول بیاض بہ بندہ گنہگار، سید مصطفیٰ حسین است میر غلام علی آزاد بلگرامی را یکصد و
بیست و ہشت سال گزشتہ انا للہ نماند بجز ذات پروردگار، اللہ بس باقی ہوس۔
کتبہ فقیر محمد حسین غفرلہ۔ بتاریخ ۶ ماہ ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ قدسیہ روز پنجشنبہ وقت صبح تحریر شد"

اس کے بعد یہ نسخہ کس کس کے پاس گیا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، اتنا البتہ معلوم ہے کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے اس نسخے کو معہ "تاریخ فرخ آباد"[1] اور "لوح تاریخ"[2] تین سو روپے میں خرید کر ۱۰ اپریل ۱۹۵۷ء کو داخل کتب خانہ کیا اور اس وقت سے یہ نسخہ یہاں موجود ہے۔

یہ نسخہ ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے ابتدائی سات صفحوں پر فہرست عنوانات درج ہے جو شیخ فیضی کی مندرجۂ ذیل رباعی سے شروع ہوتی ہے ؎

دیباچہ راز نکتہ سازان است ایں ۔۔۔ فہرست خیال جانگدازان است ایں
تعوید و دل سخن طرازان است ایں ۔۔۔ طومار جنون عشقبازان است ایں

اس فہرست کے بعد اصل بیاض شروع ہوتی ہے، پیشانی پر "رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وتمم بالخیر" تحریر ہے، اس کے بعد توحید و حمد و مناجات اور نعت و منقبت و مرثیہ کے عنوانات کے تحت مختلف شعراء کے اشعار درج ہیں، یہ حصہ ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اور شیخ عطار کی مندرجۂ ذیل رباعی سے شروع ہوتا ہے ؎

ای ذات تو بر کمال استغنا فرد ۔۔۔ فارغ ز جنایت و گناہ زن و مرد

---

[1] مولفہ مفتی محمد ولی اللہ [2] مولفہ منور علی خاں بنگش دبیر بہادر علی

گرعرصۂ کائنات کا فر گردد بردامنِ کبریات نہ نشیند گرد

ان دو عنوانات کے بعد کتاب کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس کو مولف نے "جلد اول" کہا ہے، یہ حصہ کل ۹ فصلوں اور ۷۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ "جلد ثانی" میں باسطی نے منتخبہ اشعار کو ۲۴ مختلف فصلوں کے تحت ترتیب دیا ہے جو ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، ان دونوں حصوں میں "عام مقصد کے اشعار" جمع کیے گئے ہیں، مگر "جلد ثالث" میں "مکتوبی اشعار" درج ہیں۔ یہ حصہ بھی اہم مختلف عنوانات پر مرتب کیا گیا ہے جو ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ابی شیرازی کے مندرجۂ ذیل شعر پر ختم ہوتا ہے ؎

تا ابد نور نبی چوں مہر و مہ تابندہ باد

برسرِ ما سایۂ آلِ علی پایندہ باد

ابی شیرازی کے اس شعر کے بعد اشعار کا حصہ ختم ہوجاتا ہے اور اگلے ورق سے نثری عبارت شروع ہوتی ہے جس کا عنوان "مولف دام بقاؤہ درخاتمہ نوشتہ" تحریر ہے، اسکے نیچے باسطی کے حالات زندگی درج ہیں، زیر نظر نسخہ میں کوئی دیباچہ موجود نہیں ہے لیکن گل رعنا میں دیے ہوئے "دیباچۂ بیاض باسطی" کے اقتباسات سے سوانح حیات کی عبارت اسقدر ملتی جلتی ہے کہ یہ گمان ہوتا ہے کہ تذکرہ نویس نے اسی حصے سے اقتباسات کی عبارت نقل کردی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گل رعنا کے مندرجہ اقتباسات جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے[1]، دیباچۂ بیاض باسطی کے نہیں بلکہ ان کی خود نوشت سوانح حیات کے ہیں جو علی گڈھ کے نسخے میں اخیر میں تحریر ہے، چونکہ یہ حصہ پروفیسر سید حسن کے بیان کردہ نسخوں میں موجود نہیں ہے اس لیے اس کا ابتدائی حصہ درج ذیل ہے:-

"احقر العباد بندہ علی باسطی کہ ایں بیاض را تالیف نمودہ است۔ غرض نوشتن تذکرہ نیست کہ احوال کسی را می نوشت زیرا کہ تذکرہ نویسی آداب بسیار دارد،

---

[1] دیکھئے مجلۂ علوم اسلامیہ جلد ۱ نمبر ۲ ص ۲۵

تفصیل آں بطول می انجامد لیکن چوں بعضی از تذکرہ نویسان معاصر در ذکر احوال بندگان شیخ محمد علی حزیں دام افضالہ تقریباً نام احقر عبث عبث بمیان آوردہ اند بنابریں ضرور شد کہ برای رفع گمان ناظرین آنچہ نفس الامر است گذارش نماید، موافق ضابطۂ اہل روزگار کہ برای بعضی امور مہر علیحدہ می دارند، ایں بوالہوس نیز آں مہر را کہ نقش نگینش ع

شیرافگن خاں مرید ثابت است بود مخصوص برپشت ورق اول

سخنہای دیوان سید مغفور افضل الدین محمد ثابت علیہ الرحمہ کہ دراں ایام متعہد نویسانندہ بود می نمود، و برمکاتیب بلکہ بردیگر کتب ہم نمی زد، معہذا تا آں زماں کہ فیض صحبت صاحبدلی حاصل نکردہ بود، ایں غافل انکار از صوفیہ داشت، و معنی مرید را درست نفہمیدہ بود، اما چنیں نافہمی خصوصیت بہ بندہ ندا[شت]، اکثر نوکران بادشاہی خود را در نقش نگین مرید بادشاہ عصر قرار می دہند، اگر خاکسار رعایت طرف لطف را ملحوظ داشتہ اظہار ارادت خود بجناب آں سید مغفور استاد بود نمود، گنجائش داشت، و ہرکس کہ دیدہ است میداند کہ آں سید جلیل باوجود کمال فضل و استغنا و صفت بذل و علو ہمت ہیچ نسبت با طریقت نداشتند و مرید کسی نشدہ بودند، پس دیگری را چگونہ مرید می کردند و اگر مرید آں مومن صالح شدن مضائقہ نداشت و بعد از وفات آں سید چوں ایں ہیچمداں را تسلی از حصول معلومات فن شعر حاصل نشدہ بود و بخدمت شیخ موصوف ربط نیاز و اخلاص بہم رسانید و ہر چند ایشاں ہیچکس را شاگرد خود قرار نمی دہند اما بر بندہ

اینا قدر التفات داشتند کہ اشعار سابق مرا تمام ملاحظہ فرمودہ بعض جا اصلاح ہم دادند و بر خامی آں کلام آگاہ نمودند و من آں دیوان مرتب را در آب شستم و بعد ازیں بی اینکہ در فکر موزوں کردن مصرعی افتادہ باشم قریب دوازدہ سال ادراک صحبت شیخ میسر بود و باز قصہ شعر گفتن نداشتم اما بامداد جذبۂ لطف اللہ سبحانہ تعالیٰ چوں مرا سعادت بیعت طریقت در جناب پیر و مرشد خود حضرت خواجہ محمد باسط دام بقاؤہ در ۱۱۶۲ھ دست داد و در اوائل حالات جذبۂ بی اختیار اکثر رباعی وارد می شد و دراں حالت چوں دعوائے مسلمیت شاعری در خاطر نیامدہ بود بے تکلفانہ بر بعضے اوراق می نوشتم و بایں نسبت ارادت صحیحہ باسطی تخلص کردم و سبقت را موقوف داشتم بمرور ایام رباعی بسیار جمع شد و در اوقات افاقت کہ غور کردم بانزدر فن شعر خود را ناتمام یافتم و چوں در تحصیل ہر علم کسب و تربیت کامل آں فن شرطست حالا انچہ وارد می شود از نظر جناب میر شمس الدین متخلص بفقیر مدظلہ العالی می گذرانم ....

زیر نظر نسخے میں بھی ان سب دواوین اور شعری مجموعوں کے نام اور حوالے نہیں ہیں جن سے اشعار منتخب کیے گئے ہیں، لیکن پروفیسر سید حسن کے متذکرہ حوالوں کے علاوہ اس نسخے میں جامی کی سلسلۃ الذہب، خردنامہ اسکندری، لیلی مجنوں، تحفۃ الاحرار، حزیں کی خرابات، تذکرۃ العاشقین، خسرو کی ہشت بہشت، سکندرنامہ، حکیم شفائی کی نمکدان، ملا وحشی کی فرہاد و شیریں، فردوسی کا شاہنامہ

بوستان سعدی، کلیات سعدی، میخانہ زلالی، محمود و ایاز، مثنوی مولوی، اور سلامان و ابسال کے حوالے ملتے ہیں۔

باسطی نے اس بیاض کو اپنے ذوق کے مطابق صرف اپنے لیے مرتب کیا تھا، اسی لیے منظر عام پر لانے سے پرہیز کرتے تھے، لیکن اپنے ذاتی نسخے کے حاشیے پر قائم کردہ عنوانات (”فصل“) کے تحت برابر اضافے بھی کرتے رہے، کچھ عرصہ کے بعد لوگوں کے اصرار پر جب انھیں اس بیاض کو منظر عام پر لانا پڑا تو اس کے کاتبوں نے اسکے حاشیوں کو بھی برقرار رکھا، چنانچہ نسخۂ علی گڈھ کے نسخہ کے کاتب محمد باقر نے بھی حاشیوں کے اضافے کو حاشیے ہی میں تحریر کیا ہے، یہ نسخہ کب اور کس کے نسخے سے نقل کیا گیا تھا اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، صرف ایک جگہ کی عبارت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ کاتب نے کسی مجلد نسخے سے نقل کیا تھا اور ان دونوں کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے، چنانچہ مقابلہ کے بعد متعدد غلطیوں کی تصحیح اور چند غزلوں کا اضافہ خود کاتب ہی نے حاشیہ پر کیا ہے، اس نسخے کے کاتب محمد باقر کی تحریر کے علاوہ اور بھی متعدد اصلاحی و اضافی تحریریں نظر آتی ہیں، ان کے کاتبوں کا ابھی تک پتہ چلانا دشوار ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اصلاح و اضافہ کرنے والوں میں سب سے پہلے خود باسطی کا نام آتا ہے، اس نسخے کی کتابت کی تکمیل پر ایک صفحہ شروع میں اور دس صفحات آخر میں سادہ رہ گئے تھے، اب ان سب صفحات پر اشعار درج ہیں، جو زیادہ تر خود باسطی کے قلم سے ہیں، اس اضافے میں ایک جگہ ”لمحررہ باسطی“ اور دوسری جگہ ”لمحررہ باسطی فی ۱۱۷۹ھ“ تحریر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیاض ۱۱۷۹ھ میں باسطی کے ہاتھوں تک بھی پہنچی ہے، ان ابتدائی اور آخری صفحات کے علاوہ بیاض کے اندرونی صفحات کے حاشیوں پر بھی متعدد جگہ باسطی نے خود

اضافہ کیا ہے جس سے اس نسخے کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

پیش نظر نسخے میں باسطی کے علاوہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی اپنے قلم سے اندرونی صفحوں کے حاشیوں پر اپنے ۱۲ اشعار اور دو رباعیوں کا اضافہ کیا ہے، اسی طرح سید مصطفیٰ حسین زیدی واسطی کے قلم کے اضافے بھی ملتے ہیں۔ ان اضافوں کی وجہ سے اس بیاض کا مواد بہت بڑھ گیا ہے۔ خود کاتب محمد باقر نے ۵۱۳[1] سے زیادہ شعراء کی، ۵۷۹۴[2] سے زیادہ ابیات اور ۵۶۹[3] سے زیادہ رباعیات درج کی تھیں۔ ان اضافوں سے دوسرے شاعروں ہی کو اس بیاض میں جگہ نہیں ملی بلکہ ان کی ابیات و رباعیات میں بھی اضافہ ہوگیا ہے، باسطی نے دوسرے شاعروں کا کلام زیادہ تر ان کے مجموعوں سے ہی منتخب کیا ہے، اس لیے اس اعتبار سے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، لیکن اس پہلو سے کہ باسطی کا مجموعہ کلام ضائع ہوچکا ہے اور اس کے اشعار کی معقول تعداد اس بیاض میں مل جاتی ہے۔ اس بیاض کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، اگر کوئی صاحب ذوق علی گڈھ کے نسخہ کو بنیاد بنا کر دوسرے نسخوں کا ان سے مقابلہ کرکے باسطی کے کلام کا ایک متن تیار کریں تو یہ ہندوستانی فارسی ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔

---

[1] [2] [3] دیکھئے مجلۂ علوم اسلامیہ جلد ۱ نمبر ۲ ص ۳۶

شعراء العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات و اسباب پر مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے۔ قیمت :- للعہ

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

وہ نازشِ دل یاد ہے وہ کیفِ جگر یاد
اب تک ہے وہی مجھکو تری پہلی نظر یاد

نکلی جن سے عبارت کبھی دنیائے محبت
بے ساختہ آجاتے ہیں وہ شام و سحر یاد

یوں ہونے کو ہے دیر بھی دنیا میں حرم بھی
لیکن مرے سر کو ہے فقط آپ کا در یاد

اس شان سے لوٹا ہے سرِ راہ کسی نے
افتادِ سفر یاد نہ رودادِ سفر یاد

اُس وقت سمجھتا ہوں قفس کو میں جنت
آجاتا ہے جب حادثۂ برق و شرر یاد

یہ ذوقِ تجسس ہے عجب ذوقِ تجسس
منزل کا پتہ ہے نہ مجھے راہِ سفر یاد

نازاں نہ ہو تم اپنی رسائی پہ فرشتو
ہوگی تو تمہیں بھی تمہیں معراجِ بشر یاد

مدت ہوئی جس راہ سے گذرے ہوئے جوہر
آتی ہے مجھے آج بھی وہ راہ گذر یاد

غزل

از جناب حیدر مچھلی شہری ایم اے مرحوم

بزم میں جس نے بھی سنی میرے الم کی داستاں
اس کے لب خموش سے نکلی صدائے الاماں

کشتِ غم حیات میں پھول کھلے وہاں وہاں
میری نگاہ یاس سے اشک گرے جہاں جہاں

صحنِ چمن میں آج بھی حیف نصیبِ دشمناں — چھیڑ رہے ہیں پھول کو صرصر و برق و باغباں
مستیٔ شوق و آرزو شیوۂ ذوقِ جستجو — انجمن جمال میں لائے مجھے کشاں کشاں
عشق و جنوں کی زندگی نغمۂ سازِ سرخوشی — حسن و جمالِ مہ وشاں شعلۂ باغ و گلستاں
آج بہت ہیں غم فزا شامِ بلا کی وسعتیں — آج بہت ہے درد خیز نغمہ و سازِ مطرباں
تیرے نثار آجکل کس لیے تو بدل گئی — تجھکو نہ جانے کیا ہوا لطف نگاہ دوستاں
ایسے میں ان کی یاد نے آکے بہت کرم کیا — دل بھی تھا کچھ بجھا بجھا شام بھی تھی دھواں دھواں
جنت چشم گوش ہے رہزنِ عقل و ہوش ہے — شامِ درود گل رخاں صبح بہار بوستاں
بہ ترے مجاذ ایک حیدر تفتہ دل بھی ہے — شاعر مست نغز گو زمزمہ سنج و نغمہ خواں
حیدر و تیر کے طفیل باقی رہیں گے حشر تک — وحشتِ دل کے تذکرے عشق و جنوں کی داستاں

نگاہِ مردِ مومن

از جناب انقر موہانی

یہ سچ ہے جب مقدر قوم کا برگشتہ ہوتا ہے — تو پھر افراد ملت کی نہیں چلتی ہیں تدبیریں
یہ ناممکن سرِ دشمن قلم ہوں رزمگاہوں میں — سرِ میداں چلیں کتنی ہی شمشیروں پہ شمشیریں
کہ دنیا آئینہ خانہ ہے اک جہد مسلسل کا — نظر آتی ہیں تقدیروں میں تدبیروں کی تصویریں
کمل ہو اگر حکمت تو بنجاتی ہے خود قسمت — عمل سے سعی پیہم کے ملا کرتی ہیں جاگیریں
مگر جہد مسلسل ہو، نہ ہو سعیٔ عمل پیہم — تو کام آئیں گی تحریریں، نہ دیں گی کام تقریریں
جب ایسا وقت آجائے تو اک صورت ہے ای انقر — کہ ڈھونڈھے ظلمتوں میں آدمی ایماں کی تنویریں
تجھے معلوم کیا اے چشم کافر دیکھنے والے — "نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

مطبوعات جدیدہ

العطایا النبویۃ فی فتاوی الرضویۃ ج ۳ — از مولانا احمد رضا خاںؒ، ضخامت ۸۱۶ صفحے، کتابت و طباعت بہتر، ناشر: دار الاشاعت مبارک پور، اعظم گڈھ۔ قیمت:- عہ/۱۲

مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب مرحوم اپنے وقت کے زبردست عالم، مصنف اور فقیہ تھے، انھوں نے چھوٹے بڑے سیکڑوں فقہی مسائل سے متعلق رسالے لکھے ہیں، قرآن کا ایک سلیس ترجمہ بھی انھوں نے کیا تھا۔ ان علمی کاموں کے ساتھ ہزار ہا فتوؤں کے جواب بھی انھوں نے دیے ہیں، ان کے بعض فتوے کئی کئی صفحے کے ہیں۔ فقہ و حدیث پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی، اس لیے ان کے فتوؤں میں محققانہ شان ہوتی ہے، ان کی دو جلدیں اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں، اب تیسری جلد سنی دار الاشاعت مبارک پور نے شائع کی ہے، اس جلد میں ۸۴۲ مسائل ہیں، ابھی ان کے فتاوے کی آٹھ جلدیں اور باقی ہیں، ان فتاویٰ میں بعض نئے پیدا شدہ مسائل کے متعلق بھی فتوے ہیں، جن کا جواب مولانا نے بڑی وسعتِ نظر سے دیا ہے۔

مولانا کے فتوؤں کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے تشدد آمیز فتوؤں کو حذف کر دیا جائے، یہ حالات کا بھی تقاضا ہے اور انصاف کا بھی، جن مسائل کی بنیاد پر کبھی تکفیر اور تفسیق کا بازار گرم تھا، آج ان کی یاد بھی لوگوں کے دلوں میں باقی نہیں ہے، ان کو خواہ مخواہ زندہ کر کے اختلاف کی خلیج کو وسیع کرنا اسلام کی خدمت نہیں ہے، مثلاً

صفحہ ۲۷۶ کی یہ عبارت اور بعض دوسری عبارتوں کو پڑھ کر طبیعت میں حد درجہ تکدر پیدا ہوتا ہے۔

"جو شخص وہابیہ اور اہل سنت علماء کو یکساں سمجھتا ہے، اسی قدر بات اس کے خارج از اسلام ہونے کو بہت ہے، اس کے پیچھے نماز باطل ہے، جیسے کسی ہندو یا نصرانی کے پیچھے"۔ اختلافی مسائل کے سلسلہ میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جو طرز عمل اختیار فرماتے تھے، کاش وہی یہ حضرات بھی اختیار کرتے تو بہت سے اختلافات خود بخود ختم ہوجاتے۔

بہر حال مولانا کے مخصوص خیالات سے قطع نظر ان کے فتاوے اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے، ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے،

حدیث اقبال۔ از طیب عثمانی، ضخامت ۱۶۰ صفحے، کتابت وطباعت عمدہ ناشر: دار الکتاب، سملہ پاک، ڈاک خانہ قاسمیہ، گیا، قیمت: ۳ ؍

اقبال پر مختلف زبانوں میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک مختصر کتب خانہ تیار ہوجائے گا، اردو یا فارسی کا کوئی دوسرا شاعر اس میں ان کا شریک و سہیم نہیں ہے، مگر اقبالیات کے اس پورے ذخیرہ میں روح اقبال اور اقبال کامل جیسی دو ہی چار کتابیں اور ہیں جن سے اقبال کی شخصیت اور پیام کا صحیح تعارف ہوتا ہے، زیر تبصرہ کتاب کے ذریعہ بھی اقبالیات میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے، یہ کتاب گو ایک نوجوان ندوی کی تصنیف ہے، مگر تحریریں کہنہ مشقی اور خیالات میں بالغ نظری جھلکتی ہے، کتاب میں کل دس ابواب ہیں اور ہر باب پڑھنے کے لائق ہے، ان میں اقبال کی اسلامیت آمیز آفاقیت پر بڑی اچھی گفتگو کی گئی ہے، بعض ترقی پسندوں نے اقبال کو فرقہ پرست اور آفاقیت سے حجازیت کی تنگنائے میں پھنس جانے والا کہکر ان کی عظمت گھٹانے کی کوشش کی ہے، اور بعض ان کے دو چار اشعار سے ان کا دامن اشتراکیت کے کانٹوں میں الجھانا چاہتے ہیں، اس کتاب میں ان تمام مزعومات پر بڑے اچھے انداز میں تنقید کی گئی ہے، یہ کتاب خاص طور پر نوجوانوں کے بار بار مطالعہ کے لائق ہے،

جیتا جاگتا۔ از ابن طفیل ترجمہ ڈاکٹر سید محمد یوسف صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی، صفحات ۱۶۲، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

ابن طفیل پانچویں صدی کا مشہور فلسفی گذرا ہے، اس نے فلسفہ وطب میں متعدد کتابیں لکھی ہیں، انہی میں ایک کتاب "حی بن یقظان" ہے، جس کا اردو ترجمہ جیتا جاگتا کے نام سے ڈاکٹر محمد یوسف صاحب نے کیا ہے، کتاب کی اہمیت کے پیش نظر دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہوچکا ہے، اردو زبان میں اب تک اس کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر یوسف صاحب نے اس کمی کو پورا کردیا ہے۔

اس میں عام فہم انداز میں اسلامی فکر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور خدا کی ذات وصفات اور انسان کی اصل حیثیت پر بڑی دلنشین گفتگو کی گئی ہے، مترجم نے شروع میں ابن طفیل، اس کے عہد اور مسلمانوں میں یونانی فلسفہ کے رواج کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں متعدد باتیں قابل اعتراض اور نظر ثانی کی محتاج ہیں، انکار حدیث کے سلسلہ میں معتزلہ کی تائید اور امام ابو حنیفہ کے نظریۂ درایت پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی گہرائی نہیں ہے، اور عقیدۂ آخرت کے سلسلہ میں انھوں نے پل صراط اور جنت و دوزخ کی تفصیلات کو زردشتیوں کا عقیدہ ظاہر کرکے بڑی غیر ایمانی جرأت کا ثبوت دیا ہے

غالب۔ از خورشید الاسلام صفحات ۲۸۴ کتابت وطباعت بہتر، ناشر انجمن ترقی اردو علی گڈھ، قیمت: ۔ ؍

غالب کی زندگی اور ان کی شاعری پر اردو میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن انکی زندگی

اور شاعری میں اتنا تنوع ہے کہ اب بھی کتنے گوشے تشنہ تحقیق ہیں، غالب کے زمانہ میں ہندوستان کا سیاسی انتشار اور معاشی بحران انتہا کو پہنچ چکا تھا، پرانی تہذیب کے نشانات ایک ایک کرکے مٹ رہے تھے، اور ان کی جگہ ایک نئی تہذیب آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی غالب کی زندگی اور ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پس منظر کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے جس نے غالب کی شخصیت کو بنایا اور ان کی شاعری کو دوام بخشا، مصنف نے اس کتاب میں غالب کی زندگی اور شاعری کے ایک نئے گوشے یعنی ان کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالی ہے،

کتاب میں کل چار باب اور دو ضمیمے ہیں پہلے باب میں ان کے خاندان، زمانہ اور مطالعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے باب میں ان کے قبل کے فارسی اور اردو شعراء کے کلام پر اس حیثیت سے بحث کی گئی ہے کہ غالب کے کلام پر اس کے کیا اثرات پڑے، تیسرے باب میں ان کی شاعرانہ خصوصیات پر بحث کی گئی، چوتھے باب میں غالب کی انفرادی حیثیت کا ذکر ہے، پہلے ضمیمے میں میرؔ، سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ وغیرہ کی زمینوں میں غالب نے جو غزلیں کہی ہیں ان کا ذکر ہے، اور دوسرے میں ان کے شاعرانہ ملازمے والے اشعار نقل کر دیے گئے ہیں،

کتاب کا ہر باب محنت و جستجو سے لکھا گیا ہے، البتہ اس دور کے عام ادیبوں کی طرح اس میں بھی رائے دینے میں بے احتیاطی برتی گئی ہے، اور ذرا سی بات کو افسانہ بنا کر بھی پیش کیا گیا ہے، پھر یہ بھی کوئی منطق نہیں ہے کہ شاعر کے چند اشعار یا جملوں پر ایک فلسفہ کی بنیاد کھڑی کر دی جائے،

ان فروگذاشتوں کے باوجود کتاب فکر انگیز ہے، اور مصنف نے اپنی ذہانت و طباعی سے نئے نئے نکتے پیدا کئے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب لائق مطالعہ ہے، اور اس کی اشاعت سے غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

"م۔ ج"